UNIVERSAL LIBRARY

# مولانا شبلی

## اُردو کے بہترین انشا پرداز

از قلم

سعید انصاری، بی، اے (جامعہ ملیہ)

لکھنؤ کے قدیم خادمِ اُردو رسالہ الناظر کے انعامی مقابلہ کا یہ بہترین مضمون ہے جو الناظر بابت ماہ اپریل و مئی ۱۹۲۵ء میں شایع ہوا، اور بہ اضافہ دیباچہ از جناب مولوی عبدالماجد دریابادی، بی، اے، کتابی صورت میں شایع کیا جاتا ہے۔

باہتمام

اسحاق علی علوی پرنٹر

الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع ہوا

بارِ دوم

قیمت ۱۰؍

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اُردو کی بہترین کتابیں

**بہترین انشاپرداز**
انعامی مقابلہ کے جو مضامین آزاد، حالی، نذیر احمد و شبلی کی تصانیف پر تبصرہ اور انکی انشاپردازی کے نمونے
قیمت

**تاریخ عرب**
عربوں کے فتوحات، انکے تمام علمی کمالات، ایجادات و اختراعات کا قابل دید بیان۔ از موسیو فرانسیسی۔
قیمت

## مرزا غالب مرحوم
- اُردوے معلی
- عود ہندی
- دیوان غالب مرتبہ
- مکمل دیوان غالب

## سر سید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- مضامین تہذیب الاخلاق
- خطوط سرسید

## نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت و الشوق
- مکاتیب

## مولانا حبیب الرحمن شروانی
- اسلامی اخلاق
- سیرۃ الصدیق
- علماے سلف

## مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈراما اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرن پھول
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

## مولانا ابوالکلام آزاد
- ترجمان القرآن
- تذکرہ
- ذکرِ لیلے
- الحرب فی القرآن
- جہاد اور اسلام
- قول فیصل

## مولانا محمد یونس مرحوم
- ابن رشد
- روح الاجتماع

## مولانا نذیر احمد مرحوم
- بنات النعش
- مرأۃ العروس
- توبۃ النصوح
- رویاے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانہ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ نظم بےنظیر
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد

## مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہاں بیگم
- حیدر علی سلطان
- حیات صلاح الدین

## مولوی سید احمد دہلوی
- ریاض شہرت
- تذکرہ مشاہیر

## صفدر مرزاپوری
- حیات خسرو
- امراے ہنود

## مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب مجلد
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

## مولوی رشید احمد انصاری
- المدنیۃ والاسلام
- تحریر المرأۃ

## مولوی عبدالباری آسی
- تذکرۃ الخواتین
- تذکرہ خندہ گل
- شرح دیوان غالب

- بزم خیال
- دور فلک
- مرقع ادب
- مشاغل سخن

## مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول مجلد
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- سیرۃ النبی جلد چہارم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سفرنامہ مصر و روم
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- مکاتیب شبلی دو جلد
- خطوط شبلی

## مولانا ذکاء اللہ
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- مبادی الحساب
- مساحت تھوڈولائٹ

## مولانا سید احمد دہلوی
- فرہنگ آصفیہ جلد اول
- لغات النساء

## مرزا حیرت دہلوی
- الف لیلہ و لیلہ
- قصہ حاجی بابا اصفہانی
- ناول روز الیمبرٹ
- سوانح عمری عمر عیار

## سجاد مرزا بیگ دہلوی
- الانسان
- الاستدلال
- الفہرست
- سکت منطقی

## منشی محمد مہدی
- رموز فطرت
- الانسان

النّاظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# گزارش

سعید انصاری صاحب جن کا یہ مضمون ہے، شہر اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں اور تحریر مضمون کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے۔ جن حالات میں یہ لکھا گیا اس کی کیفیت خود انکی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوگی جس میں اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ عجلت میں نظر ثانی نہ ہو سکنے کی وجہ سے بعض غلطیاں رہ گئیں۔

"مضمون کے بغیر نظر ثانی کیے ہوئے چھپنے کا افسوس ہے لیکن یہ اطمینان ہے کہ تمام اغلاط کے مقابلہ میں میرا یہ عذر کہ "میں ایک طالب علم تھا" غالباً ہر شخص کے نزدیک مسموع ہوگا"

مزید برآں، میرا بی اے کا امتحان سر پر تھا، ایک منٹ کی مہلت ملنی دشوار تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح لکھا، لیکن کوئی ایسا نہ ملا جسے کم از کم ایک بار دکھا لیتا۔ دسمبر کے آخری دو ہفتوں سے جنوری کے پہلے عشرہ تک میرے اساتذہ تعطیل میں اپنے اپنے مکانوں کو تشریف لیگئے تھے۔ میری بیکسی کا یہ حال تھا کہ

ع - خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

بنا تھا، آپ ہی کتابیں لاد کر لاتا، ۱۵-۱۵، ۲۰-۲۰ منٹ وقت نکال کر مضمون کا مسودہ تیار کرتا، پھر خود ہی صاف کرنے بیٹھتا، جو بحث طلب امور آتے اُن کے متعلق اساتذہ سے استصواب رائے کے بجائے مجبوراً اپنے ہم جماعتوں سے گفتگو کرکے اطمینان کر لیتا"

خوشی کی بات ہے کہ جس طرح سعید صاحب الناظر کے انعامی مقابلہ میں نمایاں

رہے اُسی طرح اب بی اے کے امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔ انشاءاللہ آیندہ طباعت کے وقت نظرِ ثانی کرکے وہ اُن چند معمولی نقائص کو بھی رفع کر دینگے جو اس عجلت اور مصروفیت کے باعث رہ گئے۔

اس مضمون کی قدر و قیمت کا زیادہ صحیح اندازہ اُس وقت ہو سکے گا جب مقابلہ کے جملہ مضامین کا مجموعہ شایع ہوگا۔ اس کے لیے ناظرین کو غالباً آیندہ سال تک انتظار کرنا ہوگا۔ البتہ اس اثنا میں بعض مضامین الناظر میں شایع ہو سکیں گے۔

لکھنؤ۔ یکم جولائی ۳۵ء ظفر الملک

# بارِ دِگر

سعید انصاری صاحب کا یہ مضمون، جو اُنکی تصنیفی زندگی گویا نقشِ اول تھا اتنا پسند کیا گیا کہ اب دوبارہ شایع کیا جاتا ہے۔ اور اس دفعہ اُن کو نظرِ ثانی کرنے کا بھی موقع مل گیا۔ اگرچہ وہ غالباً اس سے زیادہ مطمئن نہ ہونگے کہ عبارت کی درستی کے علاوہ کسی بڑی تبدیلی کا موقع نہیں دیا گیا۔

اور یہ اس لیے ناگزیر معلوم ہوا کہ یہی مضمون "بہترین انشا پرداز" کے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔

۸۔ دسمبر ۳۴ء ظفر الملک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

رسالۂ **الناظر** نے، جو ادب اُردو کے ایک مشہور و قدیم مرکز (لکھنؤ) میں لہا سال سے خدماتِ علم و ادب میں مشغول ہے، ادھر کچھ روز سے اپنے صفحات میں مقابلہ کے انعامی مضامین کا بھی سلسلہ قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس نے پہلا عنوان یہ مقرر کیا کہ نثر اُردو کے عناصرِ اربعہ آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی میں سب سے بہتر انشا پرداز کون ہوا ہے اور ان میں سے اُردو کی خدمت سب سے زیادہ کس نے کی ہے؟ اس عنوان سے متعلق متعدد مضامین موصول ہوئے جن میں سے بعض بڑی محنت و تلاش سے لکھے گئے تھے۔ اُن کی جانچ پانچ کہنہ مشق اربابِ علم کی ایک مجلس کے سپرد کی گئی، اس مجلس نے جس مضمون کو بحیثیت مجموعی سب سے بہتر اور قابلِ انعام قرار دیا، وہ یہی ہے، جو اسوقت مستقل رسالہ کی صورت میں الناظر بک ایجنسی لکھنؤ کی جانب سے شایع ہو رہا ہے۔

سعید انصاری صاحب، قوم کے اُن ہونہار نوجوانوں میں ہیں، جنکے مستقبل سے بہترین توقعات قائم ہیں۔ وہ صحیح معنی میں "طالب علم" ہیں اور اُنکے ذوقِ ادب کی شہادت اگلے صفحات میں ملیگی۔ جس وقت اُنھوں نے یہ مضمون تحریر کیا ہے، وہ جامعہ ملیہ علیگڈھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس کمسنی میں، اور تکمیلِ تعلیم سے قبل، اس پایہ کا مضمون لکھنا، ہر اعتبار سے قابلِ داد، اور ہر پہلو سے مستحقِ تحسین ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مجلسِ انتخاب نے انعام کا فیصلہ انھیں کے حق میں صادر کیا۔ اس مضمون کے ذریعہ سے وہ پہلی بار

اُردو کی تصنیفی دنیا میں روشناس ہو رہے ہیں۔ یقین ہے کہ پختہ کار ہو جانے کے بعد خود اُنھیں اپنی یہ پہلی کوشش حقیر نظر آئیگی۔

جس سنجیدگی کے ساتھ اُنھوں نے شبلی کے خصوصیات دکھائے ہیں اور اُنکے حریفوں سے اُنکا موازنہ کیا ہے، یہ اُنکا خاص حصہ تھا۔ نومشق مضمون نگاروں کے قلم عموماً ایسے ہی موقع آکر پھسل جاتے ہیں اور مدح و تحسین میں غلو یا ہجو و تنقیص میں بے اعتدالی سے صحیح توازن قائم نہیں رہنے پاتا۔ الحمد للہ کہ وہ اس دشوار گزار منزل سے پوری سلامتی و احتیاط کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ مجھے اُن سے جو کچھ گلہ ہے وہ صرف یہ ہے، کہ سید احمد خاں کے ساتھ اُنھوں نے انصاف نہیں برتا۔ عنوان میں بے شبہ اُنکا نام نہ تھا، لیکن موجودہ نثر اُردو کے ارتقا میں اُنکے کارناموں کو سرے سے نظرانداز کر جانا کوئی پہلو سے جواز نہیں رکھتا۔

میں خود اس باب میں بالکل "اہل سنت" کا عقیدہ رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک ان عناصر خمسہ (بشمول سید صاحب) میں سے ہر عنصر بجائے خود پوری اہمیت رکھتا ہے، اور خصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ ایک مرتب و منظم سلسلہ ہے، کسی ایک کڑی کو بھی اگر بیکار یا ناقص قرار دیا جائے، تو سارا سلسلہ درہم و برہم ہو جاتا ہے۔ مولانا شبلی سب سے آخر میں ہوئے، اس لیے قدرۃً اُنکا رنگ سب سے زیادہ شستہ ہے۔ اور علمی تحریروں کے لیے اب تک ان سے بہتر کوئی نمونہ اُردو میں موجود نہیں۔

ایک "طالب العلم" کی طرف سے یہ تحفہ اہل ملک کی ضیافت ذوق کے لیے پیش ہوتا ہے۔ خدا اسے شرف قبول عطا کرے۔ اور اُنکی آیندہ کوششوں کو ملک و ملت کے حق میں مفید ثابت کرے۔ دفتر الناظر بھی شکریہ و مبارکباد کا مستحق ہے، جو ایک جدید و ہونہار اہل قلم کو دنیا سے روشناس کر رہا ہے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بھی وہ بعض چھپی ہوئی ہستیوں کو منظر عام پر لانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

دریاباد (بارہ بنکی) ۱۵ / جون ۲۵ء — عبدالماجد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اُردو کے عناصر اربعہ

**تمہید** | جس طرح حیاتِ انسانی مرکب ہے چار عناصر سے، یعنی آب، باد، آتش، و خاک، اسی طرح ہمارے اُردو لٹریچر کی ترکیب اصلی بھی چار بڑے عناصر سے مل کر ہوئی ہے یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی، و شبلی۔ انھیں علٰحدہ کر لو تو اُردو ایک قالب بے جان اور ایک سبب بے زبان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان عناصر میں سب سے بڑا کون ہے؟ اسی سوال کا جواب دینا اس مقالے کا موضوع ہے۔ لیکن ابتدا میں اس سوال کے دو حصے ہیں (۱) ادبی (۲) علمی۔ ادبی سے مراد یہ کہ سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ اور علمی سے مقصد یہ کہ کس نے سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کی؟ سب سے پہلے ہم سوال کے پہلے حصے کو لیتے ہیں۔

**اُردو انشا پردازی کے مختلف ادوار** | یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا مصنف اپنے ماحول کا پابند ہوتا ہے یا خود ماحول کو وہ اپنا پابند بنا لیتا ہے؟ تاریخ جہاں اپنے مصنفین کی طویل فہرست پیش کرتی ہے جو اپنے گردوپیش کے اثرات کا شکار ہوئے، وہاں اس کے اوراق میں ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ماحول پر قابو پا کر مستقبل پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ہمارے مشاہیرِ اُردو بھی قانونِ فطرت کے اس شکنجے سے باہر نہیں۔ چنانچہ ان مصنفین کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنے سے یہ امر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانے کی انسانی دماغی تغیرات کا مرقع ہے اور ہر ایک اپنا جدا جدا رنگ رکھتا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں اکثر زمانہ یا دور کی تقسیم [illegible] ہے لیکن ایسا کرنا بعض وقت ضروری بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم بھی اپنے مصنفین کی

انشا پردازی کے چار مختلف دَور قائم کرنے پڑے ہیں جو ایک دوسرے سے متبائن و ممیز
نظر آتے ہیں ۔

پہلا دَور | ادب اُردو کے نشو و نما کا زمانہ وہ تھا جبکہ سلطنت مغلیہ چراغ سحری
ہو رہی تھی - اور انگریزی حکومت کا آفتاب افق مشرق سے طلوع ہو کر سارے ہندوستان
پر چمک رہا تھا - اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی زبان و علوم بھی رخصت ہو چلے تھے -
لیکن چلتے چلتے اپنی بہت کچھ یادگار چھوڑ گئے - اُردو زبان کے لیے یہ بڑا نازک وقت
تھا - اسکے مصنفین پر یہ دشوار گزار فرض عائد ہوا کہ اسلاف کے اس ترکہ میں سے صرف
وہی سامان لیں جو قابل قبول اور ضروری ہوں - انگریزی زبان کے مصنفین آج تک اس
امر کے برابر کوشاں ہیں کہ اپنی زبان سے یونانی، اور لاطینی زبانوں کے اثرات اگر کیسر مٹا
نہ سکیں تو حتی الامکان انھیں کم سے کم کر دیں - اس عہد اسلامی میں تعلیم و تعلم، درس و تدریس،
شعر و شاعری سب کچھ فارسی یا عربی میں ہوتا تھا - فارسی حکومتِ وقت کی زبان تھی اور عربی
مسلمانوں کی دینی زبان سمجھی جاتی تھی - علاوہ انکے برج بھاشا اور دوسری مقامی پراکرتیں بھی
ہندوستان میں اُسوقت موجود تھیں - جب اُردو نے ان زبانوں کی جگہ لینی چاہی تو اُسوقت
یہ سوال پیدا ہوا کہ ان میں سے کیا لے اور کیا نہ لے - پروفیسر آزاد جنھیں ان عناصر اربعہ
میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے، اپنے زمانہ کے ان اثرات کا بیّن نمونہ ہیں - انکی تحریروں
میں فارسی و عربی الفاظ کے علاوہ کثرت سے تشبیہات و استعارات ملتے ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ تشبیہ و استعارہ کا
استعمال شعرائے فارسی کے ہاں بھی تھا لیکن متاخرین نے نہ تو ان میں کوئی جدت پیدا کی اور نہ اعتدال کو ملحوظ رکھا -
اور انھی کی کورانہ تقلید ہمارے اُردو شعرا و مصنفین نے کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شے جو قدما
کے رُخِ زیبا کا خال تھا، اُردو انشا پردازی کے چہرہ پر بدنما مسّہ معلوم ہونے لگا - پروفیسر آزاد
کی ہر بات تشبیہ و استعارہ میں ہوتی ہے اور وہ بھی اکثر غیر مشبہ تشبیہوں اور مستعار استعاروں میں -
ایک دوسرا اثر جو انکی تحریروں سے نمایاں ہے وہ ہندی اور بھاشا کا ہے - ہرچند کہ یہ یہاں کی

اصلی زبانیں تھیں لیکن ان سے وہی افعال و اسماء لینا چاہیے تھے جو فارسی و عربی کے ساتھ کھپ سکتے۔ انشا پردازیا شاعر کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ جس زبان اور طرز ادا میں اپنے خیالات کا اظہار کرے، وہ زبان اور طرز ادا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زمانہ کا ساتھ دیسکیں۔ سعدی اور حافظ کو آج تقریباً چھ سو برس کا عرصہ گزر گیا لیکن انکی زبان آج بھی تقریباً ویسی ہی تروتازہ اور بالکیف معلوم ہوتی ہے جیسی اُنکے زمانہ میں تھی۔ انکی زبان کا آج بھی ہر ہر لفظ فارسی دانوں میں ویسا ہی گوش آشنا اور متعارف ہے جیسا اب سے چھ صدی پیشتر تھا۔ پروفیسر آزاد کی وفات کو ابھی صرف ۴۱ برس گزرے ہیں لیکن ابھی سے انکی زبان میں ایک طرح کی اجنبیت اور مغائرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور یہ کیفیت جتنا ہی پیچھے ہٹتے جائیے اُسی قدر زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے۔ انکی تحریر کے بیسیوں الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں، سیکڑوں تشبیہیں اور استعارے ایسے ملیں گے، جن کا آج استعمال کرنا ذوق سلیم کو غالباً گراں ہوگا۔ طرز ادا میں ایک طرح کی کہنگی اور فرسودگی نظر آتی ہے۔ مثالاً یہ تمام باتیں بدرجۂ غایت ایک تحریر میں پیش کرنا تو دشوار ہے لیکن ان کا عام انداز بیان ظاہر کرنے کے لیے دربار اکبری کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری، اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی انکے خیمہ کے پیچھے جا کر آواز بلند چلایا کہ مستو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہونچے اور دریا بھی اُتر لیے۔ اُسوقت خان زماں کے کان کھڑے ہوے۔ گر جانا کہ آصف خاں کی بلا آئی ہے، مجنوں خاں قاقشال کو بھونس بتا بھی نہ سمجھا تھا، کچھ یہ دانہ کی" (دربار اکبری، صفحہ ۲۲)

دوسرا دور | اُردو انشا پردازی کا دوسرا دَور ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے افسانوں کے رنگ میں روز مرہ لکھنے کی کوشش کی۔ ان کا مولد اگرچہ بجنور کے ضلع میں تھا لیکن بچپن سے لیکر اخیر عمر تک قیام زیادہ تر دہلی میں رہا، اس لیے انھیں

دہلی کی عام زبان اور روزمرہ کے استعمال کا بہترین موقع حاصل تھا - انکی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ہر واقعہ اور ہر خیال کو عام فہم سے عام فہم طریقہ پر اور سہل سے سہل زبان میں ادا کیا جائے۔ چنانچہ اسی لیے وہ بالکل ٹھیٹھ اور عامیانہ الفاظ و محاورے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارے انکے ہاں کم ہیں، اور جو ہیں وہ زیادہ تر دیسی - لیکن اس کوشش میں وہ غالباً اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عام بول چال اَور ہوتی ہے اور تصنیفی زبان کچھ اور۔ تصنیفی سے ادنیٰ اور اعلیٰ دو طبقے ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہے ہیں اور اس بنا پر دونوں طبقوں کی زبانیں بھی مختلف رہی ہیں - انگریزی زبان میں لندن کو وہی درجہ حاصل ہے جو اُردو میں دہلی کو۔ لیکن انگلستان میں باوجود تعلیم عام ہونے کے لندن کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ علمی طبقہ کی زبان سے بالکل جداگانہ ہے۔ کوئی انگریزی زبان کا مصنف اگر لندن کی بازاری زبان لکھنے کی کوشش کرے یا بھولے سے کوئی لفظ یا محاورہ اسکی تحریر میں آجائے تو نقادانِ زبان کی زد سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ڈپٹی صاحب بھی عام بول چال اور روزمرہ لکھنے کی کوشش میں ایسی زبان لکھ گئے ہیں جو دہلی کے عام طبقوں یا بعض مخصوص محلّوں اور کوچوں میں بولی جاتی ہے - روزمرہ لکھنا ہر چند کہ مطبوع اور پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ اس قدر محدود اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہو کہ دوسرے حلقوں میں سمجھی نہ جاسکے اور اسکے سیکھنے کے لیے انھیں دُور دراز مسافت طے کرکے اُن مخصوص حلقوں میں آنا پڑے۔ خود ڈپٹی صاحب نے اپنی اس خامی کو محسوس کیا اور لغات مروجہ کے معانی پر اکتفا نہ کرکے انھیں اپنے ترجمہ قرآن میں اپنے مخصوص استعمال کردہ الفاظ و محاوروں کی ایک طویل فرہنگ لگانی پڑی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہر قوم میں عام بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور علمی یا تصنیفی زبان اَور۔ جہاں تک ڈپٹی صاحب کے قصص اور افسانوں کا تعلق ہے ممکن ہے کہ ان میں یہ زبان زیادہ ناگوار نہ معلوم ہو، لیکن اس امر پر کسی دو رائے کا

اتفاق ہونا ممکن نہیں کہ یہ زبان سنجیدہ علمی مضامین، یا مقدس مذہبی خیالات کی بھی متحمل ہو سکتی ہے ڈپٹی صاحب نے بعض آیاتِ قرآنی کے ترجمہ کرنے میں ایسے رکیک اور سخیف الفاظ استعمال کیے ہیں جنھیں سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

روزمرہ اور عام فہم زبان لکھنی اگرچہ ڈپٹی صاحب کی خصوصیت نمایاں ہے لیکن خود چونکہ عربی کے جیّد عالم تھے۔ زمانۂ طالب علمی سے عربی زبان و ادب سے خاص ذوق رکھتے تھے، عربی کے اثر نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دلّی کی زبان لکھنے بیٹھے ہیں لیکن عربی کے ادق اور مشکل الفاظ بھی جا بجا لکھتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں مفرد کے بجائے مرکب اور وہ بھی تین چار مفردات سے مرکب الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ عربی اقوال اور ضرب الامثال کی آمد بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ قرآن کی آیات بھی گاہے گاہے آجاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اجتماعِ اضداد جسے ڈپٹی صاحب باوجود کوشش کے نہ نبھا سکے اور یہ معجون مرکب نہ تو اُنکے ادب لطیف کے لیے پورے طور پر راس آیا، اور نہ مذہبی لٹریچر ہی کے لیے۔ ان کے اندازِ بیان کا ہر پہلو تو یہاں پر دکھانا ممکن نہیں لیکن انکی تحریر کا عام رنگ کسی حد تک اس عبارت سے معلوم ہو جائیگا۔ اپنی مشہور کتاب توبۃ النصوح کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"اب سے دو ایک سال پہلے دہلی میں ہیضہ کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سنّاٹا اور ویرانی، جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدمی آدھی رات کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اُجڑے پڑے ہیں کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا، اختلاط، ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کہنے کو زندہ، پر مُردے سے بدتر۔ نہ دل میں ہمت نہ پاؤں میں سکت۔ یا تو گھر اٹوانٹی کھٹوانٹی لیکر پڑ رہا یا کسی بیمار کی

تیمارداری کی یا کسی عزیز آشنا کا مرثیہ یاد کرکے کچھ رو پیٹ لیا۔ مرگ مفاجات ابھی دنوں کی موت تھی۔ نہ نشان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے الش کی۔ پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختل ہوگئے، الا ماشاء اللہ کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا، ورنہ جی کا متلانا اور قضائے مبرم کا آجانا"۔ (توبۃ النصوح صفحہ ۲)

تیسرا دور — تیسرا دور مولانا حالی سے شروع ہوتا ہے، جنکے پیش نظر ایک طرف پروفیسر آزاد کی وہ زبان تھی جو تشبیہات اور استعاروں سے پُر، دوسری جانب ڈپٹی نذیر احمد کی زبان جو فارسی وعربی زبان کے ساتھ ساتھ دلی کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے مملو تھی۔ مولانا حالی نے ان ہر دو عناصر کی ترکیب باہمی سے ایک نئی زبان پیدا کرنی چاہی جو دونوں رنگ کے حامیوں میں مقبول اور پسندیدہ ہو۔ انکی تحریریں اس بات کا صاف پتہ دیتی ہیں کہ کس طرح اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے آزاد کے ہاں سے فارسیت اور عربیت لی گئی ہے اور نذیر احمد سے سادگی اور عام فہمی۔ لیکن حالی نے ہر دو رنگوں کی اصل روح لینے کے بجائے صرف انکی ظاہری خصوصیات کی تقلید کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زبان بلا کی پھیکی اور بے مزہ ہوگئی۔ صفحے کے صفحے پڑھ جاؤ، نہ جذبات میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر۔ حالی کی سب سے معرکۃ الآرا تصنیف کم و بیش ایک ہزار صفحوں کی کتاب ہے، شروع سے اخیر تک پڑھ جائیے لیکن ایک ٹکڑا عبارت کا بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے قلب پر رنج و خوشی، محبت و نفرت، درس عبرت کے جذبات کا کوئی اثر طاری ہوتا ہو۔

مولانا حالی کے ادبی شباب کا وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی حکومت کا پورے طور سے ہندوستان پر تسلط ہو چکا تھا۔ انگریزی علوم و ادب، تہذیب و تمدن کا گھر گھر چرچا تھا۔ انگریزی لکھنا، بولنا، ایک قابل فخر امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ آزاد کی طرح حالی بھی اپنے اس جدید ماحول کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور اردو میں بلا تامل انگریزی زبان کے الفاظ اور فقرے استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اچھے خاصے اردو الفاظ کے ہوتے ہوئے انگریزی کے مفردات و مرکبات استعمال کیے ہیں لیکن یہاں بھی اسی ظاہری تقلید کا خیال رکھا ہے۔ انگریزی زبان

سے جدید خیالات یا تشبیہات و استعارات کو کسی قدر تصرف کے ساتھ اُردو میں لاتے تو وہی آج
اس زبان کے رُخِ زیبا کے خط و خال بنتے یا بضرورت ایسے انگریزی الفاظ لیے جاتے جن کے
مرادف اُردو میں نہ ہوتے تو آج اُردو کے خزانہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی
سے اس ظاہری تقلید کے اثر نے حالی کی زبان کو بے انتہا پھیکی، غیر دلچسپ اور بے اثر
بنا دیا۔ ذیل کی عبارت اُنکے عام اندازِ بیان کا ایک نمونہ ہے۔

"سرسید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے
تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو اُنھوں نے گزشتہ چالیس پچاس برس میں سرانجام
کیں، وہ کون کرتا۔ اُنھوں نے ایسے کاموں کے لیے جو ہندوستان میں اور خاصکر مسلمانوں
میں بالکل نئے تھے، اور جن پر خرچ کرنے کی کبھی کسی کو عادت نہ تھی، دس بارہ لاکھ سے کم وصول
نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کو کام نہ فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں
کے کیسہ میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو مہمان سرا نہ بناتے تو علیگڑھ کا
ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزارہا
روپیے اپنے پاس سے صرف کر کے اطرافِ ہندوستان میں چندہ کے لیے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ
کمیٹی کے ذمہ ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے، کیونکر اپنا
وقار قائم رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ یورپین طریقہ پر ہائی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے
ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر توجہ کرا سکتے تھے" (حیاتِ جاوید ص ۲۱۲)

چوتھا دور | اُردو کے چار ادوار جو ہم نے قائم کیے ہیں، مولانا شبلی اس سلسلہ کی آخری کڑی
ہیں۔ انھوں نے آزاد کی "شاعرانہ اُردو" "نذیر احمد کی سوقیانہ اُردو" اور حالی کی "روکھی
پھیکی اُردو" دیکھی، خود ایک دُوربین نظر اور نقد پسند طبیعت رکھتے تھے، معاملہ کی اصل تہ کو پہونچ گئے
اُنھوں نے دیکھا کہ آزاد کی طرح تشبیہات و استعارات کی آورد اُردو کی قوت برداشت سے
باہر ہے، نذیر احمد کا عامیانہ طرزِ بیان اور سوقیانہ انداز زبانِ اُردو کے علمی کی شان سے

پست تر ہے۔ حالی کی بے نمکی اور پھیکا پن اردو انشاپردازی کے حق میں سم قاتل ہے۔ زمانہ کا بھی رنگ پہچانا کہ اب نہ وہ پہلی سی اسلامی حکومت ہے جو فارسی و عربی کا وہ غلبہ باقی رہ سکے۔ اور نہ ہندوستان کا ہر شہر دہلی اور لکھنؤ ہے۔ جہاں کی ٹکسالی زبان تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور نہ انگریزی حکومت کے ساتھ انگریزی زبان کا یہ اثر دیا ہے کہ اسکا ہر لفظ اور ہر فقرہ قابل قبول ہو سکے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ "برادران وطن" ناگری رسم خط کے ساتھ ہندی کی ترویج میں کس طرح کوشاں ہیں۔ ان تمام زمانی و مکانی دشواریوں کا لحاظ کرتے ہوئے مولانا شبلی نے وہ طرز بیان اور انداز زبان اختیار کیا جس میں آزاد کی سی شوخی تحریر، نذیر احمد کا روزمرہ اور حالی کی سادگی اور سب بیک وقت موجود ہے۔ مگر ہر ایک عنصر اپنے اپنے اعتدال کے ساتھ۔ انکی تحریروں میں نہ اس قدر تشبیہات و استعاروں کی بھرمار ہوتی ہے کہ زبان صرف شاعری کے لیے وقف ہو جائے، نہ اسقدر سوقیت اور عامیانہ پن کہ سنجیدہ اور علمی مضامین کو اس کا جامہ پہننے سے عار آئے اور نہ ایسی پھیکی اور بے مزہ کہ پڑھنے والے پر کوئی اثر یا جذبہ طاری نہ ہو۔ شبلی کی زبان کو لیجیے اور اُسے خواہ شاعری جیسے نازک اور لطیف مضامین کے لیے استعمال کیجیے، خواہ علمی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو اسکا ذریعۂ اظہار بنائیے یا جی چاہے اسے ادب لطیف میں برتیے۔ ہر صنف ادب اور ہر طرز ادا میں قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔ ایم مہدی حسن جو اُردو کے ایک نہایت ہونہار بلند پایہ انشاپرداز تھے مولانا شبلی کے متعلق ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اُردوئے خاصہ" کی داد دیتے جس نے ایک نوخیز باندی یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اُٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دُنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانوں پہلی سی بچی کھچی باتیں سمجھ سکتی تھی۔ مدتوں شعراء ستے گا دُعا استاد رہا۔ یہ اقتضائے سن بُری طرح

کُھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے، کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے۔ اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملا کے منجھلے بیٹے ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا، 'اری اٹھ جا دنگی میں صورت کے'۔ لیکن دفعۃً اسکی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے اب وہ مقدس علما کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن بنا گیا ہے خوش او معاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انھی کے تصرف میں رہتی ہے۔" (افادات مہدی۔ پہلا ایڈیشن صفحہ ۲۴۲)

شبلی کی "اردوے خاصہ" کی داد ایک غالب ہی سے کیوں چاہیے' آج اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مولانا شبلی کی اس خدمت کا جو اُنھوں نے اُردو کو حیات جاوید بخش کر کی ہے ہر شخص کو معترف ہونا چاہیے۔ اُردو زبان انکے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی جنھوں نے اسکو "دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملانے کے" قابل بنایا، جنھوں نے اسکو ملک کے "منچلوں" کی "پردہ دری اور بے آبروئی" سے "بال بال بچایا" جنھوں نے "کل کی چھوکری" کو "مقدس علما کی کنیزوں" میں داخل ہونے کا شرف بخشا، دلی اور لکھنؤ کے شعرا اور ادیب بلبل کی تذکیر و تانیث 'کسو' اور 'تلک' کے جھگڑوں، دشوار قوافی اور سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور ایک پورب کا رہنے والا دلی سے سیکڑوں اور لکھنؤ سے بیسیوں میل دُور کا باشندہ اُردو کو آب بقا سے سیراب کرنے اور اسکے لیے حیات جاوید کے سامان فراہم کرنے میں سرگرم تھا۔ خوش ہوں اہل دلی و لکھنؤ کہ اُس نے انکی زبان کو وہ زندگانی بخشی کہ اغیار اسکے مٹانے کی کوشش کرینگے اور وہ نہ مٹ سکیگی اُس نے اسکو وہ مرتبہ بخشا جسپر ہندوستان کی دوسری زبانیں رشک کرینگی، اُس نے اسے اس قابل بنا دیا کہ آیندہ نسلیں اسے اپنے خیالات کے بے تکلف اظہار کا ذریعہ بنائیں گی اُس نے اس لیے

قبول عام اور دیرپا قیام کے اجزا کی ایسی ترکیب دی جو آئندہ ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی اہل ہوسکے گی۔ مولانا شبلی کا عام انداز بیان اس طرح کا ہوتا ہے:۔

"دنیا میں جس قدر حکمراں گزرے ہیں، ہر ایک کی حکومت کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا، یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعتہً فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔ سکندر ہر موقع پر ارسطو کی ہدایتوں کا سہارا لیکر چلتا تھا، اکبر کے پردہ میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے، عباسیہ کی عظمت و شان برامکہ کے دم سے تھی۔ لیکن حضرت عمر کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا۔ خالدؓ کی عجیب و غریب معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ فتح و ظفر کی کلید انھی کے ہاتھ میں ہے لیکن جب حضرت عمر نے انکو معزول کردیا تو کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ کل سے کونسا پرزہ نکل گیا ہے؟ سعد وقاص فاتح ایران کی نسبت بھی لوگوں کو اسی قسم کا وہم پیدا ہو چلا تھا، وہ بھی الگ کردیے گئے اور کسی کے کان پر جوں بھی نہ چلی۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عمر خود سارا کام نہیں کرتے تھے اور نہ کرسکتے تھے لیکن جن لوگوں سے کام لیتے تھے اُن میں سے کسی کے پابند نہ تھے۔ وہ حکومت کی کل کو اس طرح چلاتے تھے کہ جس پرزہ کو جہاں سے چاہا نکال لیا اور جہاں چاہا لگا دیا مصلحت ہوئی تو کسی پرزہ کو سرے سے نکال دیا اور ضرورت ہوئی تو نئے پرزے تیار کر لیے۔" (الفاروق، صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵)

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ اُردو کے عناصر اربعہ کی انشا پردازی پر ایک اجمالی تبصرہ تھا، اور اسی ضمن میں ہر ایک کی تحریر کا ایسا نمونہ بھی پیش کیا گیا جس سے اسکے عام انداز بیان کا پتہ چل سکے۔ لیکن اس امر کے تصفیہ کے لیے کہ ان میں سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے، ضرورت اسکی ہے کہ سب سے پہلے انشا پردازی کا ایک معیار قائم کیا جائے اور اسکی ضروری خصوصیات قرار دی جائیں پھر دیکھا جائے کہ کون اس معیار پر سب سے زیادہ پورا اترتا ہے، اور کس میں یہ خصوصیات زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہیں؟

انشا پردازی کی تعریف | اس غرض کے لیے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ انشا پردازی کسے کہتے ہیں؟ اگر یہ صرف مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے تو اس میں حیوان و انسان سب برابر ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر اکثر اعضا کے اشارات سے یا کبھی اپنی مخصوص بولی میں اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کر لیتا ہے اور انسان کے جذبات دلی موضوع الفاظ کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کتے کو جب اس کا مالک پیار کرتا ہے تو وہ محبت سے دُم ہلانے لگتا ہے۔ یا بلی جب بھوکی ہوتی ہے تو مسکینیت بھری آواز سے "میاؤں میاؤں" کرنے لگتی ہے لیکن انسان جذبۂ محبت یا اشتہائے غذا کے اظہار کے لیے موضوع کلمات زبان سے نکالتا ہے۔ چنانچہ اسی وصف کو جو حیوان و انسان کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے، عربی میں "نطق" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے لیکن اگر مجرد نطق کا نام انشا پردازی ہوتا تو یوں زبان سے اظہار مطلب کرنے کو جاہل و عالم، دیہاتی و شہری سب کرتے ہیں مگر ہر ایک انشا پرداز نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک دریا طغیانی پر ہے، ایک دیہاتی اسکو پار کر کے اپنے گانوں کو جاتا ہے، گھر پہنچکر وہ اپنے بیوی بچوں میں راستہ کی سرگزشت کا جس معمولی طریقہ پر ذکر کریگا اُسے انشا پردازی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اسی واقعہ کو جب کوئی بڑا انشا پرداز بیان کریگا تو وہ پانی کے تلاطم، موجوں کے تھپیڑے، کھڑی فصلوں کے تہِ آب ہونے، اور جل تھل سب ایک ہو جانے کی کیفیت کو جس موثر طریقہ پر بیان کریگا اُس سے سننے والے کے دل پر خوف و دہشت اور حیرت و استعجاب کا ایک گہرا اثر طاری ہو جائے گا۔ دُور کیوں جائیے، اصل لفظ کے معنی پر غور کیجیے۔ انشا کے لغوی معنی اُبھرنے اُبھارنے، یا بلندی و ترفع کے ہیں، چنانچہ انشا کے لغوی معنی میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے، اور مجازاً شعر کہنے یا خطبہ دینے کے بھی ہیں۔ اور وہ اسی بنا پر کہ شاعر یا خطیب ایک تو خود جذبات سے پُر ہوتا ہے، دوسرے وہ اپنے کلام اور جادو بیان سے دوسروں کے جذبات اُبھار سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ اثر انگیز تحریر کے لیے بولا

جانے لگا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا "منشی" ہے یعنی وہ اعلیٰ درجہ کا لکھنے والا ہے گو اب یہ لفظ گر کر عرف عام میں محرر یا کلرک کے معنی میں مستعمل ہونے لگا ہے۔

**خطابت، شاعری اور انشاپردازی کا فرق** | مذکورۂ بالا تشریح کے مطابق جب انشاپردازی کی غایت اصلی اثر ریزی اور جذبہ انگیزی ٹھہری تو پھر خطابت، شاعری اور انشاپردازی میں فرق ہی کیا رہا؟ (یہاں پر فنون لطیفہ کی صرف اُن اصناف سے بحث ہے جنکا اظہار الفاظ کی شکل میں بذریعہ تقریر یا تحریر ہوتا ہے۔ اس بنا پر مصوری، بُت گری، و نقاشی وغیرہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں)۔ خطابت میں زیادہ تر فوری جوش و اثر کا ابھارنا مقصود ہوتا ہے کوئی اتفاقی واقعہ پیش آیا اور اُسکے لیے سامعین کے جذبات کو تھوڑی دیر کے لیے مشتعل کر دیا گیا لیکن جیسا ہنگامی جوش و خروش کا چڑھاؤ ہوتا ہے ویسا ہی فوری اسکا اُتار بھی۔ مد و جزر کی طرح ان جذبات کو ایک حالت پر کوئی قیام نہیں۔ اس وقتی اثر انگیزی کے لیے خطیب کو اپنے گرد و پیش کی اشیا سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ یا مثال و حکایت کے لیے اسے بعید از قیاس یا دیر فہم چیزوں سے کام لینا مناسب نہیں۔ کیونکہ سامعین کے جذب توجہ یا غور و فکر میں ادنیٰ سی تاخیر بھی خطیب کی تمام محنت کو رائگاں کر دیگی۔ مثلاً ایک مقرر اپنے مخاطبین کو قتل و خونریزی کی یاد دلانا چاہتا ہے تو وہ بجائے اسکے کہ میدان کربلا کا نقشہ کھینچے یا کسی خونریز جنگ کے واقعات بیان کرے اس کا صرف یہ کہدینا کافی ہوگا "مجھے تم میں سے کتنوں کے سر تن سے جدا نظر آتے ہیں؟ کتنوں کی لاشیں زمین پر تڑپتی دکھائی دے رہی ہیں؟" یا مثلاً وہ سامعین کو صلح جوئی اور امن پسندی کی تلقین کرنی چاہتا ہے، بجائے اسکے کہ وہ فلسفۂ امن و صلح بیان کرے تو وہ ہاتھ سے اشارے کر کر کے یہ کہتا ہے کہ "تم جس غرض سے آج اس چھت کے نیچے جمع ہوئے ہو کیا سمجھتے ہو کہ تم اپنی زمین سے ایک رائی برابر بھی اپنے دامن میں (دامن کو ہاتھ سے پکڑ کر) لیکر اُٹھو گے؟" غرض خطابت کی جوش انگیزی اور اثر ریزی صرف وقتی و ہنگامی

ہوتی ہے - یہ جوش و خروش نہ اس سے زیادہ ٹھہرتا ہے اور نہ اسے زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔
شاعری کا مطلب عام طور پر موزوں کلام سمجھا جاتا ہے یعنی کلام میں ایک طرح کا وزن پایا جائے - آگے چل کر قافیہ و ردیف کی شرط بھی آ جاتی ہے۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک شاعری نام ہے تخئیل کا - یعنی ایسا کلام جسے شاعر کی قوت تخئیل نے نہایت لطیف اور پُر اثر طریقہ پر ادا کیا ہو - ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ شاعری ایک طرح کی محاکات ہے اور وہ محاکات کے دائرہ کو اسقدر وسعت دیتا ہے کہ تخئیل اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس گروہ کے نزدیک واقعات زمانہ یا مناظر قدرت کا نقشہ اس طرح پر پیش کیا جائے کہ کلام کے سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جو اس پر ان مناظر کو خود دیکھنے سے ہوتا۔ معنی کے لحاظ سے اگرچہ موخرالذکر دونوں گروہ پہلے گروہ سے مختلف ہیں لیکن کلام میں وزن ہونے کی وجہ سے انھیں بھی انکار نہیں - جو اسکو شاعری کا ایک جزو سمجھتے ہیں گو اول الذکر گروہ کی طرح اُسی کو اصل شاعری نہیں قرار دیتے - ایک اور خاص فرق جو خطابت اور شاعری میں ہے، وہ یہ کہ شاعر کو اپنے مخاطب سے کوئی غرض نہیں ہوتی، وہ جن جذبات سے خود متاثر ہوتا ہے یا جو واقعات اس کی نظر سے گزرتے ہیں، اُن جذبات و واقعات کو ظاہر کر دینا اُسکی اصل غرض ہوتی ہے لیکن اس طریقہ پر کہ کوئی شخص جب پڑھے یا سنے تو وہ بھی انھی جذبات سے متاثر ہو۔ شاعری کی ظاہری حیثیت سے ایک خاص بات جو اس میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ یعنے کلام میں وزن کے التزام اور قافیہ و ردیف کی پابندی سے ضروری و مناسب الفاظ کی ادھر اُدھر پر ممکن نہیں ہوتی - اور نہ اس قید اور پابندی کی وجہ سے یہ کلام ہر شخص اور ہر وقت کے لیے مناسب اور ممکن ہو سکتا ہے - دوسرے معنی کے لحاظ سے شاعری میں صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شرط اولیٰ لازمی امر نہیں بلکہ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ اظہار جذبات کے جوش اور تخئیل کی پابندی وارفتگی میں صحت واقعہ اور حقیقت امر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

اِن دونوں کے برعکس انشا پردازی کی غرض و غایت کچھ اور ہے۔ اسکا مقصد خطابت کی طرح نہ تو فوری جوش و خروش اور ہنگامی اثر کا پیدا کرنا ہوتا ہے اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات یا خیال آرائی ہی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ایک مستقل بالذات شے ہے۔ اسکا مخاطب نہ تو کوئی انسانی مجمع ہوتا ہے اور نہ وہ تمام تر متکلم ہی کی ذات سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنی اثر انگیزی میں ایک خاص ثبات اور مناسبت رکھتی ہے، جو نہ بالکل وقتی ہوتی ہے اور نہ ضرورت سے زائد۔ اسکے ہاں نہ تعجیلِ اثر کا لحاظ ہے جس سے انشا پرداز صرف پیش گرد و پیش کی چیزوں پر اکتفا کرے، نہ اوزان و قوافی کی قید جس سے غیر ضروری یا نامناسب الفاظ کی بھرتی کرنی پڑے اور نہ اسکے ہاں تخئیل کی بلند پروازی اور محاکات کی شرط جس سے صحتِ واقعات اور اظہارِ حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انشا پردازی اظہارِ خیالات اور تحریرِ واقعات کا ایک ایسا آلہ ہے جو الفاظ کی بیجا نمائش اور معانی کے مبالغہ اور غلو سے پاک ہے۔ اسکے ذریعہ واقعات نہایت سیدھے سادہ طریقہ سے ادا کیے جاتے ہیں۔ خیالات میں کوئی ہیر پھیر اور پیچ نہیں ہوتا۔ تشبیہ و استعارہ کی جگہ زیادہ تر نفس واقعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ غرض یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ہر معمولی شخص کے لیے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔

**الفاظ و معانی** اسی سلسلہ میں ایک نہایت لطیف اور دلچسپ بحث یہ آتی ہے کہ آیا انشا پردازی کا دارومدار الفاظ پر ہے یا معانی پر؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انشا پردازی نام ہی بہترین الفاظ کے بہترین طریقہ پر استعمال کرنے کا۔ نئے معانی و خیالات ہر روز نہیں پیدا ہوتے ایک ہی خیال ہوتا ہے جو مختلف انشا پرداز مختلف طریقہ پر ادا کرتے ہیں، لیکن ان میں جو فرق ہوتا ہے وہ انتخاب الفاظ اور جدت ادا کا۔ کوئی اسی خیال یا واقعہ کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کسی کا طریقہ بیان اور انتخاب الفاظ ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے سے ایک خاص کیفیت اور اثر طاری ہونے لگتا ہے۔ انگریزی زبان کے جاننے والے اس

نکتہ کو اس مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ ہزاروں مصنفین نے لکھی ہے لیکن جو کیفیت اور اثر لارڈ میکالے کی تاریخ کے چند ابواب پڑھکر ہوتا ہے وہ اور کسی کی تحریر سے ممکن نہیں دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انشا پردازی یا حسن بیان موقوف ہے اعلیٰ معانی اور اچھے خیالات پر۔ جب تک معانی میں کوئی ندرت یا خیالات میں کوئی کشش نہ ہو نرے الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تحریر میں اثر اُسی وقت ہوتا ہے جب خیالات پُر اثر ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ دنیا کے اکثر بڑے معلمین بڑے انشا پرداز بھی مانے گئے ہیں۔ انگریزی ادب میں زبان کے لحاظ سے انجیل کا جو درجہ مانا جاتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بعض نقادان فن مہاتما گاندھی کے طرز تحریر کو بھی انگریزی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ الفاظ و معنی کا تعلق جسم و روح کا تعلق ہے جس طرح تنہا روح یا خالی جسم پر زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح لفظ کو معنی سے یا معنی کو لفظ سے جدا کر کے انشا پردازی کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ اگر الفاظ نہایت شاندار اور پُر شکوہ ہیں لیکن بے معنی ممکن ہے کہ پڑھنے والا بادی النظر میں ان سے متاثر ہو جائے لیکن جہاں ذرا سنبھلا اور خیال معنی کی طرف منتقل ہوا، وہ اثر فوراً غائب ہو جائیگا۔ انشا پردازی کے متعلق اکثر غلط فہمیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ یہی حال معنی کا ہے۔ خیالات اور معانی خواہ کتنے ہی اعلیٰ اور بلند ہوں لیکن انکے ادا کرنے کے لیے الفاظ ناقص اور ناموزوں استعمال کیے گئے ہوں تو ان مضامین و خیالات کا مطلق کوئی اثر نہ ہوگا۔ دنیا میں کتنے ہی بلند خیالات اور اعلیٰ معانی پیدا ہوئے لیکن وہ اس وجہ سے مقبولیت اور رواج نہ پا سکے کہ انکا طریقہ اظہار اور طرز ادا [illegible] سب [illegible] پُر اثر نہ تھا۔ غرض الفاظ و معانی کا تعلق جسم و جان کا تعلق ہے اور انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اور مشترک خوبی اور موزونیت کا نام ہے جسکی بہترین مثال ہماری آسمانی کتاب قرآن کریم ہے۔

اس بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع اور مانع خصوصیات بیان کی ہیں، ایک فصاحت اور دوسری بلاغت۔ ان میں سے ایک کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہوتا ہے اور دوسری کا معانی سے۔ اب ہم ان میں سے ہر خصوصیت اور اسکی جزئیات سے علیحدہ علیحدہ بحث کرینگے اور اسی کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کرینگے جس سے یہ واضح ہو جائیگا کہ مولانا شبلی میں یہ خصوصیات کس حد تک پائی جاتی تھیں اور انکے دوسرے معاصرین میں اسکی کس قدر کمی تھی۔

فصاحت اور اُسکے جزئیات

فصاحت میں زیادہ تر کلام یا تحریر کی لفظی حیثیت سے بحث ہوتی ہے، یعنی الفاظ اپنی ظاہری حیثیت سے کیسے ہیں؟ بولنے یا سننے میں وہ کیا اثر رکھتے ہیں؟ صرفی قاعدہ کی رو سے ان کا کیا درجہ ہے؟ اور تحریر بلحاظ مجموعی کیسی ہے؟

فصاحت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں۔ الفاظ کی صفائی اور شستگی سے مراد یہ ہے کہ انکے بولنے میں زبان کو دشواری اور سننے میں کانوں کو ناگواری نہ ہو۔ مثال کے طور پر مولانا شبلی کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:-

"آج میں نے ایک عجیب دلآویز خواب دیکھا۔ عجیب اس لیے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دلآویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جلسے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے مفصل سُنیے۔ آج جمعہ کا دن ہے اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ یہ سیر صرف اُن لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گزرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔" (مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۵)

اسی کے برعکس تحریر کا ایک بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ ثقیل اور گراں ہوں، جنکے بولنے سے زبان کو دشواری اور سننے میں کانوں کو ناگواری ہوتی ہو۔ بعض وقت تحریر

ہیں وہ ایک ثقیل لفظ کا آجانا بھی ساری عبارت کی لطافت برباد کر دیتا ہے۔ آزاد کی مشہور کتاب دربار اکبری سے چند سطریں بطور مثال پیش ہیں :-

"ایک سوار حکم شاہی لیکر دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرہ کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر آیا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارہ پر چوٹ لگانی بھی بھول گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر توجہ کی۔ لشکر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے سے چھپائے اور تیر اندازی شروع کی۔ اکبر نے پکار آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو؟ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس آتا تھا، جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹ کر جدا ہوا ہے اور جنگل کا رخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا، متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندستان میں دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل پڑھا ہے، اب کوئی اس پر فتح نہ پا سکے گا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور شاہی لشکر کی خبر سنتے ہی اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اسکا جیسے چیونٹیوں کی قطار ہو ایسے کترا کر نکل گیا۔ اسکا گھوڑا اگھوٹ چلا جاتا تھا۔ یہ کمبخت بھی تھوہڑ میں الجھا اور خود زمین پر گر پڑا۔"

(دربار اکبری صفحہ ۳۴۱ و ۳۴۲)

صفائی شستگی اور ثقالت و گرانی کی تمیز بہتر طور پر تو انسان کا لطیفہ سامعہ ہی کر سکتا ہے لیکن علمائے فن نے اسکے لیے کچھ اصول بھی مقرر کیے ہیں، مثلاً حروف تہجی میں بعض حروف ایسے ہوتے ہیں جن کا تلفظ زبان سے آسانی ادا ہو جاتا ہے اور کانوں کو ان کا سننا گراں بھی نہیں گزرتا، جیسے ب، ت، ر، ز، وغیرہ۔ بعض حروف ایسے ہوتے ہیں جنکے بولنے اور

سننے دونوں میں ناگواری ہوتی ہے جیسے ٹ، ڈ، ڑ، وغیرہ۔ اسی طرح الفاظ میں بھی ان حروف میں سے کسی ایک کے آنے یا اُن میں سے دو یا تین کے قریب قریب جمع ہو جانے یا ایک ہی حرف کی تکرار سے ثقل و گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر زبان بجائے شستہ اور لطیف ثقیل ہو گئی۔ ان دونوں قسم کے الفاظ جمع ہو گئے ہیں۔ "مکاتیب شبلی" کی اول الذکر عبارت میں پوری مشکل سے کوئی ثقیل یا کریہہ لفظ بتایا جا سکتا ہے بلکہ برعکس اسکے "دلاویز" "مسیحا" "شوق" "سیر" کے آجانے سے زبان و گوش دونوں کو ایک خاص حظ محسوس ہوتا ہے۔ برعکس اسکے "دربار اکبری" کی ثانی الذکر عبارت میں "کھٹکے" "جھٹپٹے" "فتوں" "گٹھڑے" "کھنڈری" "ٹھونڈ" کے الفاظ سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کو ایک طرح کی گرانی اور ناگواری محسوس ہوگی۔ علاوہ اسکے بعض جگہ ہاے دوچشمی "ھ" اور "ڑ" کے قریب قریب آجانے سے، یا لفظ "تھا" پر فقروں کے ختم ہونے سے عبارت کی تمام موسیقی زائل ہو گئی ہے۔

فصاحت کی ایک بڑی خوبی روزمرہ اور عام بول چال کا استعمال ہے۔ روزمرہ سے مراد وہ زبان ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے شایستہ اور مہذب لوگ استعمال کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے الفاظ و محاورات بالکل عام اور مروج الوقت ہونگے مولانا شبلی سے بڑھکر اس نکتہ کو کسی نے نہیں سمجھا۔ انھوں نے نہ تو جدید اور قدیم علما کی معرب اردو لکھی اور نہ دہلی اور لکھنؤ کی بازاری زبان اختیار کی بلکہ انھوں نے مہذب اور شایستہ طبقہ کی زبان کو اپنے لیے انتخاب کیا۔ جسکا اندازہ کسی حد تک ذیل کی عبارت سے ہو سکے گا:۔

"مدت سے قدمبوسی نہیں ہوئی اور بہت جی چاہتا ہے۔ میرا آنا نہیں ہو سکتا اس لیے امید کرتا ہوں کہ آپ ہی قدم رنجہ فرمائیں۔ ۱۱ دسمبر سے یہاں نہایت عمدہ جلسے اور سیریں ہونگی اور ۱۹ دسمبر تک کالج ایک تماشہ گاہ بنا رہیگا۔ پھر بیچ میں وقفہ ہو کر ۲۷ دسمبر سے کانفرنس شروع ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ۱۱ تاریخ تک تشریف لائیں بیچ میں دلی اور آگرہ کی سیر بھی ہو جائیگی اور آپ نہایت محظوظ ہونگے۔"

(مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۲۱-۲۲)

لیکن بعض وقت روزمرہ کے مفہوم سے مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے یعنی اکثر سادگیِ بیان اور سہل زبان کے یہ معنی سے لیے جاتے ہیں جو قریب قریب سوقیت اور ابتذال کے ہم معنی ہو جاتے ہیں۔ خواندہ اور ناخواندہ جب تک یہ دو طبقے کسی سوسائٹی میں موجود ہیں اُس وقت تک انکی زبانوں میں بھی فرق رہیگا اور اس اختلافِ حالت کی بنا پر ہر دو طبقے کے الفاظ و محاورات اور اقوال و امثال بھی مختلف رہیں گے۔ ایک انشا پرداز کا فرض یہ ہے کہ انتخاب زبان کے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھے۔ ہمارے متاخرین میں اسکے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی ڈپٹی نذیر احمد کو ہوئی ہے جنھوں نے روزمرہ لکھنے کی کوشش میں سوقیت و ابتذال کو داخلِ زبان کیا اور وہ بھی بُری طرح۔ توبۃ النصوح میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونوں باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اُدھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہو گئی۔ نعیمہ اُس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینے کا پہلوٹھی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت سے پلی، نانی کی چہیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، اس پر لاڈ پیار سے وہیں کو عادت ہے، کڑوا اور نیم چڑھا اور بھی بدمزاج ہو گیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیونکر گزر ہونے لگا تھا۔ ہو نگوڑے کے ساتھ تھوڑا اور وقت کا کھٹکا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہو گیا۔ اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ گو بے عقلی کی پرلی نہ گیا۔ بات بات پر بگڑ ہوئی بیٹی تھی، قرآن سیپارہ بھی ختم تھا۔ کہنا بیٹی میں سوداگر کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا الفاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو یا ہے ان کو بھی دھتکا بتایا، بلبلاتے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی، مردوں کا لحاظ اٹھا دیا۔ نعیمہ ماں کے روبرو بیٹیوں کا بیڑا اٹھاتے تو اٹھا لیا لیکن نعیمہ کے منہ سے بڑی بڑی گستاخی ہو جاتی تھیں اور جی بڑی بیں کستی تھی کہ دو بھی اس بھیڑوں کے پیچھے کہ جھیروں کی بڑی اسر منہ کو کبھی نہیں شکر گی۔"

(توبۃ النصوح، صفحہ ۲۹)

یہ اسی زبان کا نمونہ جو اردو کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے پیش کی گئی ہے۔ روزمرہ کا استعمال ہر زبان کے ناول اور افسانوں میں ہوتا ہے مگر وہ اس قدر محدود خطہ کی زبان نہیں ہوتی جسے دوسری جگہ کے لوگ سمجھ نہ سکیں۔ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے بعض گلیوں اور کوچوں کے لوگ اٹھا سکتے تھے۔

فصاحت کے سلسلہ میں ایک بڑی نازک بحث سلاست و عدم سلاست کی آتی ہے بعضوں کا خیال ہے کہ سلاست و روانی بذات خود کوئی وصف نہیں بلکہ روزانہ کی بول چال یا اور کثرت استعمال سے تحریر میں سلاست و روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کلام مجید کا جب یہ وصف ابوالعلا معری سے (جس نے قرآن کا جواب لکھا تھا) بیان کیا گیا تو اس کمبخت نے جواب دیا کہ "ہاں ابھی نہیں میرا کلام بھی جب کچھ عرصہ تک نمازوں میں متواتر کثرت سے پڑھا جائیگا تو اس میں بھی وہی سلاست و روانی پیدا ہو جائیگی"۔ لیکن اس طرز استدلال میں ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ سلاست و روانی کا دارومدار کثرت استعمال ہی پر تمامتر نہیں بلکہ خود الفاظ معانی اور ترکیبوں میں بھی بعض خصوصیات ایسی موجود ہوتی ہیں جن سے تحریر میں سلاست اور روانی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بعض الفاظ میں ایک طرح کی نزاکت و لطافت اور بعضوں میں ایک شان و شکوہ پایا جاتا ہے جن کے آنے سے تحریر میں ایک روانی پیدا ہو جاتی ہے، مگر بعض الفاظ ثقیل اور بھونڈے ہوتے ہیں جن سے عبارت میں ایک رکاوٹ اور منافرت آجاتی ہے۔ ان کی خصوصیات مع مثال کے ذیل میں زیادہ تصریح کے ساتھ آئینگی۔

تحریر میں عدم سلاست یا منافرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر الفاظ و محاورے متروک ہوتے ہیں یا طریقہ بیان بدلا ہوا ہوتا ہے، یا بعض وقت اسماء و ضمائر کی غیر ضروری تکرار ہوتی ہے۔ ان اسباب سے تحریر میں وہ روانی اور سلاست باقی نہیں رہتی جو ایک مروجہ الفاظ اور غیر متروک انداز بیان کی عبارت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں آزاد کی عبارت سلاست کو اچھی طرح واضح کریگی۔ لکھتے ہیں:

"سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی اُس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی، وہ خانخاناں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم کو بہت چاہتی تھی اور وہ لڑکا بھی اُس سے بہت ہلا ہوا تھا۔ اور خان خاناں اپنے فرزند مرزا عبدالرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا، اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا۔ ایک دن شام کے قریب سہس لنگ وہاں کے تالاؤ میں نواڑے پر بیٹھا، پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے قریب کشتی سے نماز کے لیے اُترا۔" (دربار اکبری، صفحہ ۱۹۱)

اس مختصر سی عبارت میں اتنے الفاظ مثلاً "ہلا ہوا" "خار" "تالاؤ" "نواڑے" ہیں جن کا استعمال یا تو بالکل ہی ترک ہو گیا ہے یا بعض کا موقع استعمال بدل گیا ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ طرزِ بیان کی اجنبیت ہے۔ دیکھو کہ ابتدائی چاروں جملے "تھی" کے لفظ پر ختم ہوتے ہیں۔ اور بعد کے جملوں میں "تھا" کا التزام رکھا گیا ہے۔ اسکے علاوہ بعض الفاظ مثلاً "خانخاناں" "مرزا عبدالرحیم" اور "وہ" کی تکرار سے عبارت میں کس قدر اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ نقص آزاد کی تحریر میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ ہزاروں متروک الفاظ و محاورے مثلاً "ٹیخ ٹیخ کر" "ناک گھسنی کرنا" "باسن" "چھندیانا" "کھوانا" اسکے ہاں ملیں گے۔ طرز ادا میں عام طور پر ایک طرح کی گنگی اور دیرینہ پن پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر میں اگر ایک طرف عربی کے دقیق لغات ہیں تو دوسری جانب اُردو کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورے بھی ہیں جن سے کہیں کہیں تحریر کی روانی و سلاست میں فرق آجاتا ہے۔ اول الذکر الفاظ اپنی دشواری کی وجہ سے چل نہ سکے، موخر الذکر اپنی عمومیت کے سبب ترک ہو گئے۔ عربی الفاظ، ضرب الامثال اور آیاتِ قرآنی کے استعمال میں تو ڈپٹی صاحب اپنے کمال عربی دانی اور حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے مجبور تھے جسکی مثالیں طوالت کے اندیشہ سے دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، لیکن عامیانہ و دقیانہ الفاظ کے استعمال کی کثرت تو افراط کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ جن میں سے بعض الفاظ کا نقل کر دینا دلچسپی سے

خالی نہ ہوگا۔ مثلاً "سٹک جانا" "چھیڑ خانی" "چمکا لگانا" "اکڑ فوں" "کنی کاٹنا" "چیلے چانٹے" "توتھمبو" "پھندا رکھنا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سن کر غالباً آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ تمام الفاظ قرآن مجید کے ترجمہ میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ ایک تحریر کیا ایک تصنیف میں آجانے سے نہ صرف اسکی سلاست کو بلکہ اسکی وقعت کو گھٹا دینے کے لیے کافی ہیں۔

مولانا حالی کی تحریریں بھی جو عام طور سے نہایت سیدھی سادی زبان لکھنے کے لیے مشہور سمجھے جاتے ہیں اس عیب سے پاک نظر نہیں آتی۔ ان کی تصانیف سے ایک طویل فہرست ایسے الفاظ کی تیار کی جاسکتی ہے جو یا تو دقیق ہونے کے باعث رفتار زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے یا حد سے زیادہ عامیانہ ہونے کی وجہ سے زبان کا مذاق لطیف انکو نبھا نہ سکا۔ عربی کے ایسے مشکل اور ادق الفاظ مثلاً "منوہ بالشان"۔ "استطرادی"۔ "مطارحات"۔ "محارست" اور الکل کی اردو زبان بولنے والے طبقہ میں رواج پانا بہت دشوار تھا۔ برعکس ایسے عامیانہ الفاظ جیسے "تلپٹ"۔ "اولو"۔ "تیکھاپن" "منہ تجڑا" وغیرہ کو قوم کا ادبی مذاق بھلا کب گوارا کر سکتا تھا!

یہاں تک تو حرف فارسی کے دقیق یا عربی اور ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے بحث تھی جو تحریر میں مانع سلاست و روانی سمجھے جاسکتے ہیں۔ لیکن اب ایک تیسرے عنصر سے بحث ہے جو نہ صرف مانع سلاست ہے بلکہ خود زبان کے حق میں سم قاتل ہے۔ اس عنصر سے ہماری مراد انگریزیت ہے۔ آزاد کے زمانہ میں جبکہ فارسی کا پھیلا ہوا اثر استقدر باقی تھا کہ انگریزی زبان کی جانب اپنے شوق سے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھی گئی۔ خود حضرت آزاد مرحوم اس زبان سے کچھ بہت واقف بھی نہ تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی اپنا اثر پھیلاتی گئی اور ایسا کیوں نہ کرتی، آخر بادشاہ وقت کی زبان تھی۔ اس زمانہ میں "تعریف کرنا" بڑے فخر و مباہات کی بات سمجھی جاتی

تھی جس شخص کو انگریزی کی الف بے بھی آتی وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہی تھا۔ تھے جن کی بابت مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی اس انگریزیت کا بے طرح شکار رہے۔ مولانا نذیر احمد کے لیے سرکاری ملازمت کی وجہ سے اس زبان کا سیکھنا ناگزیر تھا چنانچہ انھوں نے اسے بڑے شوق سے سیکھا اور مفید سیکھ لیا۔ یہ اسی شوق کا اثر ہے کہ انگریزی کا رنگ انکے ابتدائی مضامین میں بہت زیادہ نظر آتا ہے خصوصاً لکچروں میں تو صریح اور معلوم ہوتی ہے۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کا یہ حال ہے کہ انکے درباری لکچر کے صرف ایک صفحہ پر "سپورٹ" (کفالت کرنا) "ٹالریشن" (رواداری) "ٹمپٹیشن" "نیوٹرلیٹی" (مذہبی غیر جانبداری) "ایجوکیشن" (تعلیم) "پارٹی" (قسم یا صفت) "کوانٹیٹی" (مقدار) اتنے الفاظ آئے ہیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک کے لیے بہتر سے بہتر اردو کا لفظ موجود تھا نہ صرف الفاظ بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ انگریزی کے امثال فقرے اور مرکبات بھی استعمال کرتے گئے ہیں مثلاً "ٹو بی اور ناٹ ٹو بی" To be or not to be "جیک آف آل ماسٹر آف نن" Jack of all, master of none "دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ" The last though not the least "اپ ٹو مارک" Upto Mark "سینیر ممبر" Senior Member "ریونیو بورڈ" Revenue Board وغیرہ وغیرہ۔

مولانا حالی اس اثر کا سے کچھ کم شکار نہ ہوئے اور یہ نقص ان کی سب سے بڑی تصنیفات "حیات سعدی" "یادگار غالب" تک میں پایا جاتا ہے۔ صفحے الٹتے چلے جائیے اور آپ کو انگریزی کے مفرد و مرکب الفاظ برابر ملتے جائیں گے مثلاً "ورکس" (تصانیف) "امیٹیشن" (تقلید) "میٹریل" (مواد) "ریفارمیشن" (اصلاح) "ججمنٹ" (فیصلہ) "ایشیاٹک پوئٹری" (ایشیائی شاعری) "پوئٹیکل کمپلیمنٹ" (شعری تعریف) "سلف ریسپکٹ" (خودداری) "پبلک اسپیکنگ" (مجمع عام میں تقریر کرنا) "امپورٹل" (مستقل)

اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ مرکبات ہیں جن میں ایک انگریزی لفظ ہے اور دوسرا اُردو۔ مثلاً "کرسچینیٹی سلطنت" (عیسائی سلطنت) "کرٹیکل طریقہ" (ناقدانہ طریقہ)۔ "لٹریری دنیا" (علمی دنیا) وغیرہ۔ قوسین میں دیکھو کہ مذکورۂ بالا الفاظ میں سے ہر ایک کا اُردو مرادف اُسی زور معنی کے ساتھ مل سکتا تھا یا نہیں؟ لیکن کیا اسے ادب اُردو کی خدمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ خواہی نخواہی اس بن بُلائے مہمان کو جگہ دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انشا پرداز کو قوم کا اعلیٰ درجہ کا نباض اور زمانہ کا بہت بڑا شناسا ہونا چاہیے جو لوگوں کے میلان طبع اور رفتار زمانہ کے رخ کو پہچان سکے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ قوم کا مذاق ادبی پر کیا اثر پڑ رہا ہے اور زمانہ اُسے کس طرف لیجا رہا ہے۔ مولانا شبلی اس راز سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اُردو کا خمیر کچھ اور ہی ہے اس میں عربی و فارسی کی آمیزش صرف وہیں تک ہو سکتی ہے جہاں تک اسکے اصل مزہ میں فرق نہ آئے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اُردو دہلی اور لکھنؤ ہی تک محدود نہ رہیگی بلکہ اسے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلنا ہے۔ انگریزی کے اس قبول عام کو دیکھ کر انھوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ رنگ جمنے والا نہیں۔ جس دن ہندوستانی چیتے، یہ رنگ آن کی آن میں اُڑ جائیگا۔ اس لیے اس زبان سے صرف وہی الفاظ لینے چاہییں جو ناگزیر ہوں یا جو اپنے ساتھ کوئی نئے معنی و مفہوم رکھتے ہوں۔ یہ اسی حقیقت شناسی کا نتیجہ ہے کہ علامہ شبلی کی ابتدائی سے ابتدائی تحریریں بھی اُٹھا کر دیکھیے، ان عیوب سے بالکل پاک نظر آئینگی۔ اس وقت ہمیں جو پُرانی سے پرانی تحریر دستیاب ہو سکی ہے وہ مئی ۱۸۸۶ء کا ایک خط ہے جسے اُنھوں نے نینی تال سے اپنے والد بزرگوار کو بھیجا تھا۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں:-

"گو میرا قلم، خامۂ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب غریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں۔ تاہم مجھ کو امید نہیں کہ اس کوشش سے

عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہونگے، اپنے شوق و انتظار کا صلہ مل جائے۔ میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے۔ لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ و فرحت زا" ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ میں اسکو "فرحت زا" بھی مان لونگا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں اُنکا مذہب کیا پوچھنا، ع ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

اب حالات سنیئے، کارٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کارٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے جس پر راستہ چلتا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جسکی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔ دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دار السلطنۃ ہوتے۔ ......"

(مکاتیب شبلی۔ حصہ اول صفحہ ۹-۱۰)۔

فصاحت میں جہاں تک الفاظ کا انفرادی تعلق تھا، گزشتہ صفحات میں اس پر کافی بحث ہو چکی۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یعنی عبارت کی صورت میں انشا پردازی کی اس خصوصیت کو کہاں تک دخل ہے؟ اسکے لیے علمائے فن نے دو اصول قرار دیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مضامین اور تمثیلیں اس قدر عامیانہ اور رکیک نہ ہوں کہ اُن سے تنفر پیدا ہو بلکہ نہایت دل پسند اور خوش کُن ہوں۔ دوسرے یہ کہ تحریر نہ اتنی طویل ہو کہ سنتے سنتے جی گھبرا جائے اور نہ اتنی کوتاہ کہ مطالب خبط ہو جائے۔ اِن دو خصوصیات کے اندازہ کے لیے کوئی آلہ اور پیمانہ تو ہو نہیں سکتا، البتہ صحیح مذاق ہی اس کا بہتر اندازہ کر سکتا ہے۔ مولانا حالی نے اپنے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں جہاں شاعری کی تدریجی رفتار کا ذکر کیا ہے اُسکو ایک مثال کے ذریعہ اس طرح واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ بھوکے تھے اور انھوں نے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھائے تھے، انھیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اس کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھلوا کر اور مناسب مسالے اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی سے کمال دکھانا چاہتا ہے تو اپنا استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے، اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہ گیا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چیٹ پٹی باتوں پر فریفتہ کرے۔"

(مقدمہ شعر و شاعری صفحہ)

اور پھر اسی کے بعد تین چار مثالیں یکے بعد دیگرے اسی مضمون کو واضح کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان میں ایک دوسرے سے کوئی خاص فرق و امتیاز نہیں اور عامیانہ پن اس قدر ہے کہ پڑھنے سے طبیعت میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے لیکن اسی ارتقاء شاعری کے مضمون کو مولانا شبلی صرف ایک مثال سے واضح کرتے ہیں جسے پڑھ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی رفتار کی مثال ایک قوم کی مادی ترقی سے دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: -

"ابتدا میں رہنے سہنے کے لیے پھونس کے جھونپڑے اور خس پوش کچی دیواریں ہوتی ہیں، پھر پختہ عمارتیں بنتی ہیں، پھر ان میں مختلف حصے، شہ نشین، دالان، صحنچیاں، بالاخانے قائم کیے جاتے ہیں۔ کمرے فرش فروش سے سجائے جاتے ہیں، جھاڑ فانوس، دیوارگیریاں لگائی جاتی ہیں، تاہم اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ پھر سنگ مرمر کی عمارتیں شروع ہوتی ہیں، جواہرات کی پچی کاری ہوتی ہے، دیواروں پر طلائی نقش و نگار بنتے ہیں، اطلس و کمخواب کا فرش بچھتا ہے، دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتے ہیں، کافوری شمعیں جلاتے ہیں، یہ ترقی کا آخری دور ہے جس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے۔" (شعر العجم حصہ۔ صفحہ ۱۱)

دوسرے اصول یعنی تحریر نہ طویل ہو نہ کوتاہ۔ اسکی مثال میں سیرۃ النبی کی شروع کی چند سطریں پیش کر دینا کافی ہوگی جن میں ایک نہایت وسیع مضمون کس قدر اختصار اور خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

"اس کا سب سے زیادہ صحیح سب سے زیادہ کامل سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کیے جائیں نہ جبر و زور سے کام لیا جائے بلکہ فضائل کا ایک پیکر مجسم سامنے آ جائے جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو جسکی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جسکا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں"۔ (سیرۃ النبی حصہ ۲ ص ۱)

اسی مضمون کو اگر زیادہ بیان کرتے تو دفتر کا دفتر سیاہ کر ڈالتے۔ زور بیان پیدا کرنے کے لیے آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے لیکن پھر بھی نہ جانے یہ بات بھی پیدا ہوتی یا نہیں جو ان چند سطروں میں ہے۔

**بلاغت اور اسکے جزئیات** انشا پردازی میں فصاحت کا جہاں تک تعلق تھا، اسکا بیان ہو چکا اب اسکی دوسری خصوصیت بلاغت کا ذکر ہوگا۔ بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں مطلب یہ ہے کہ کوئی تحریر اسوقت تک بلیغ نہیں کہی جا سکتی جب تک وہ فصیح بھی نہ ہو۔ پھر بھی بلاغت کا تعلق زیادہ تر الفاظ و تحریر کی معنوی حیثیت سے ہے۔ یعنی تحریر میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہوں وہ معانی کے لحاظ سے اپنی جگہ بالکل مناسب اور با موقع ہوں۔ نازک اور لطیف مضامین کے لیے دلنشین الفاظ ہوں اور شاندار و پرشکوہ واقعات کے لیے دبدبہ۔ الفاظ، رنج و غم کے لیے درد آمیز اور غمناک اور مسرت و خوشی کے لیے سرور بخش و فرحت زا الفاظ استعمال کیے گئے ہوں۔ تاکید اور زور پیدا کرنے کے لیے الفاظ موکد اور مکرر ہوں۔ غرض تحریر واقعہ یا جس خیال کو انشا پرداز ادا کرنا چاہتا ہے اس کا صحیح صحیح

اور پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کھینچکر رکھدے۔ بلاغت کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ انشا پرداز جس سماں کو پیش کرنا چاہتا ہے اسکے لیے وہ ایسے الفاظ اور ایسا طریقۂ بیان اختیار کرے جس سے معلوم ہو کہ اس حالت کے وقت وہ خود موجود تھا۔ مولانا شبلی نے "سیرۃ النبی" میں جہاں رسم قربانی سے بحث کی ہے وہاں حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعۂ ذبح کو اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا وہ وہاں موجود تھے اور اُردو زبان میں بلاغت کی مثال اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی باہمی گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اب ایک طرف نو رسالہ پیر ضعیف ہے جسکو دعاہاے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اُسی محبوب کے قتل کے لیے آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھُری ہے۔

"دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے۔ ملائکہ قدسی، فضاہاے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے

| | |
|---|---|
| یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا | ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں |
| كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (صٰفّٰت) | کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ |
| طفیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل | در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند" |

(سیرۃ النبی، حصہ ا، صفحہ ۱۱۵)

غور کرو اور دیکھو کہ اس مختصر سی عبارت کے پڑھنے کے بعد جو نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے کیا وہ یہ نہیں ہے کہ ایک ضعیف کہن سال شخص دل مضبوط کرکے ایک کمسن مسکین بچہ کے گلے پر چھُری پھیرنا ہی چاہتا ہے کہ اتنے میں آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور وہ اپنے ارادہ سے

باز آجاتا ہے۔

بلاغت کی ایک دوسری خوبی جیسا کہ بیان کی گئی یہ ہے کہ الفاظ مناسب موقع و محل ہوں۔ یعنی جنگ و جدل کے واقعات اگر بیان کرنے ہوں تو شاندار اور پُرشکوہ الفاظ لائے جائیں اور حسن و عشق کی داستان اگر کہنی مقصود ہو تو نازک اور لطیف الفاظ استعمال کیے جائیں۔ یہی فرق ہے جسے اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو کلام یا تحریر کا اثر کما حقہٗ نہیں ہوتا۔ یہ فرق اردو کے دو بڑے انشا پردازوں کی تحریروں سے بخوبی واضح ہو جائیگا۔ مولانا شبلی جنگ قادسیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"سعد نے دیکھا کہ ہاتھی جس طرف رخ کرتے ہیں دل کا دل پھٹ جاتا ہے ضخم و مسلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے کہا کہ انکی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا جرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمہارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیجدیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کر لیں۔ پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر ابیض کی طرف بڑھے۔ عاصم بھی ساتھ تھے، دونوں نے ایک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لیکر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا، وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اسکے پیچھے ہوئے اور دم کے دم میں یہ سیاہ بادل چھٹ گیا۔ اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گونج سے زمین دہل دہل اٹھتی تھی۔" (الفاروق صفحہ)

تحریر بالا میں دیکھو کہ مضمون کی مناسبت سے کیسے کیسے الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً "دل کا دل" "بلائے سیاہ"۔ "مہیب و کوہ پیکر" "مہم" "نرغہ"۔ "سیاہ بادل"۔ "رن"۔ اسی طرح ایک جنگ کے

حالات شمس العلما آزاد نے "دربارِ اکبری" میں بیان کیے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"عصر کا وقت تھا کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھاؤ پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کیے کہ کشتیوں پر سوار ہو کر جائیں اور میدانِ جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھ کر اوپر سے گولے برسانے شروع کیے اور اکثر کشتیاں انکے روکنے کو بڑھیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھنے والے سمجھے کہ بادشاہ بہادر دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دھوئیں اڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے حریف دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بھی چڑھاؤ کی جھپٹ توڑ کر جانا کچھ آسان کام نہ تھا، اور کمک کو غنیم نے رستہ میں روکا ہوا تھا۔ دوسری مقامِ جنگ پر گولے مارنے شروع کیے۔ انکے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں۔ اب ایک طرف پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعہ سے گولے چھٹنے شروع ہوئے مگر یہ بادبان ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا کہ تیر کی طرح سیدھی معرکۂ جنگ پر آئیں۔ بادشاہی فوج کناروں پر اتری ہوئی تھی اور سینہ بہ سینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے مورچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی مگر تقدیر سے کون لڑ سکے۔ غالب یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا اور باقی فوج قلعہ پر قابض ہو گئی۔" (دربارِ اکبری۔ صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳)

اسی کے آگے فتح پٹنہ کا بیان آتا ہے جو اس سے کچھ کم تصنع نما نہیں ہے۔ پھر اسکے بعد بنگالہ فتح کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور آئندہ کا نقشہ جنگ مرتب کیا جا رہا ہے۔ جنگ کے زمانے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر سنجیدگی طلب اور غور و فکر کا موقع ہے۔ لیکن آزاد کا رنگینی پسند قلم یہاں بھی گل و بلبل کی ہمنوائی سے ہیں ہٹتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لیے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بندوبست ہو جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خوں ریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔

اُٹھ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں کہ جی جا رہے۔ نبیؔ نے گلچیں اور عظمت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی بات سچی ہے۔" (دربار اکبری صفحہ ۲۴۲)

بلاغت کی ایک اور بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب ایک ہی معنی کے متعدد الفاظ ہوں تو اُن میں سے صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جائے جو معنی کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں ہوں ورنہ یوں ادائے مطلب کے لیے تو ہر شخص کچھ نہ کچھ لکھ لیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادنیٰ مطالب کا جو ہجوم ایک لفظ میں ادا ہو جاتا ہے وہ سطروں میں ادا نہیں ہوتا۔ ایک اچھے انشا پرداز کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ اس میں انتخابِ الفاظ کا صحیح ذوق موجود ہو۔ مولانا شبلی کی نقد پسند طبیعت اس نکتہ کو خوب سمجھتی تھی چنانچہ ایک جگہ پر شیخ سعدی کے سومنات جانے کے واقعہ کو اس طرح پر لکھتے ہیں:۔

"شیخ سعدی سومنات گئے۔ یہاں ایک عظیم الشان بتخانہ تھا۔ پجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ ایک دن ایک برہمن سے کہا کہ مجھ کو سخت حیرت ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں، وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بتخانہ میں چرچا پھیل گیا۔ سب اُن پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے؟ برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے۔ میں نے بھی بہت سفر کیے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اس میں ہے کسی میں نہیں۔ یہ ہر روز صبح کو دعا کے لیے خود ہاتھ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں رہے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا اور بتخانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پجاری مندر میں رہا کرتے ہیں۔"

(شعر العجم - حصہ دوم - صفحہ ۴۲)

مندرجۂ بالا عبارت میں دیکھو کہ جو خاص الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں ان کے ہی قسم کے ہم معنی لفظوں پر کیا وجہ ترجیح ہے۔ "راہ و رسم" کے ہم معنی اردو میں بہت سے الفاظ ہیں مثلاً

ملاقات'، 'شناسائی'، 'دوستی'، 'جان پہچان'۔ لیکن ملنے جلنے کی ابتدا کرنے اور آمد و رفت رکھنے کا جو مفہوم "راہ و رسم" میں پایا جاتا ہے، وہ ان میں سے کسی میں نہیں۔ پھر "پتھر" کے ایک لفظ کہہ دینے سے بُت کی شان میں حقارت و مذمت کا جو اظہار ہوتا ہے، اُسکے لیے پجاریوں کی برہمی اور ہنگامہ آرائی کافی دلیل ہے۔ اسی مفہوم کو حقارت و مذمت کے لفظ کے ساتھ ایک سطر میں ظاہر کرتے تو اس میں بلاغت کی وہ شان نہ رہتی۔ آگے چل کر ایک لفظ "معجزہ" کا آیا ہے جو عین اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس ایک پنج حرفی لفظ میں مذہبی تقدس اور جذبات عقیدت کے جو مفہوم داخل ہیں، انکو برہمن کی زبان سے ادا کرنے کے لیے اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہو نہیں سکتا تھا اسی کے بالمقابل شیخ سعدی کی زبان سے بُت کے اسی فعل کو "شعبدہ" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں میں عقیدت اور عدم عقیدت کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ فن بلاغت کا ایک ایسا باریک نکتہ ہے جس کا لحاظ شبلی ہی سا نقادِ فن کر سکتا تھا۔ "شعبدہ" کے قریب المعنی الفاظ اور بھی بہت سے تھے مثلاً 'کرشمہ'، 'ماجرا'، 'تماشا'، لیکن ان میں سے کسی میں وہ بات نہیں جو "شعبدہ" کے لفظ میں ہے۔ "چومنا" اور "بوسہ دینا" ان دونوں لفظوں میں بظاہر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن اول الذکر سے جس عقیدت و خلوص کا اظہار ہوتا ہے، وہ دوسرے سے نہیں بلکہ اس سے ایک حد تک تکلف و تصنع ٹپکتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایک خالص اردو کا مفرد لفظ فارسی کے مرکب لفظ پر بہر صورت مرجح تھا۔ بعینہٖ یہی فرق "پوجنے" اور "پرستش کرنے" کے الفاظ میں بھی ہے۔ جس مذہبی عقیدت اور خلوص کو ظاہر کرنے کیلیے اور الفاظ آتے ہیں، اسی غرض کے لیے "خشوع و خضوع" کا استعمال بھی ہے لیکن شیر لائے ہوئے کسی مذہبی عقیدت و خلوص کے خیال کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔

بالکل اسی واقعہ کو مولانا حالی نے بھی اپنی حیات سعدی میں بیان کیا ہے، ذیل میں انکی عبارت کو پڑھو اور دیکھو کہ کیا انھوں نے بھی بلاغت کی ان دقیقوں کو ملحوظ رکھا ہے؟

وہ لکھتے ہیں کہ :-

"جب میں (سعدی) سومنات پہونچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دُور دُور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھکو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں - اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی - ایک روز اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں ؟ اور اُسکے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی - برہمن نے مندر کے پُجاریوں کو خبر کردی - سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا - میں نے مصلحتاً اسکے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کہی، میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں، اس لیے اسکی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں، تاکہ سمجھ بوجھ کر اسکی پوجا کروں - اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو مندر میں رہ، تجھکو اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی - میں رات بھر وہاں رہا - صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے - یہ دیکھتے ہی سب "جے جے" پکارنے لگے - جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا - کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا ؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا - سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اُس مورت کے سامنے لے گئے - میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا" (حیات سعدی، صفحہ ۳۴ و ۳۵)

**ایک اور طریقہ** افراد کی اہلیت اور قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک منصفانہ طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اُبھر کر کہاں تک آئے ہیں ؟ انکی بلند پروازی کی آخری حد کہاں تک پہونچتی ہے ؟ انکی ترقی کا پارہ زیادہ سے زیادہ کس درجے پر آتا ہے ؟ اور پھر اسکے بعد باہم مقابلہ کرکے دیکھا جائے کہ ان میں کون سب سے آگے ہے ؟ اب تک

ہم انشا پردازی کی تعریف، اسکی غرض، اور اُس کی دو بڑی خصوصیات یعنی فصاحت وبلاغت اور اُنکی جزئیات سے بحث کرتے آئے ہیں اور اُنکے ثبوت میں ہر چہار عناصر کی تحریروں کے نمونے پیش کیے ہیں جس سے یہ بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ مولانا شبلی کا درجہ اُردو کے عناصر اربعہ میں کس پایہ کا ہے! اب ہم اس طریقہ کے مطابق ان انشا پردازوں کی تحریروں کے منتخب اور چیدہ نمونے جو ان کے اختراع فائقہ کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں، پیش کرتے ہیں اور فیصلہ خود ناظرین کے مذاق سلیم اور انصاف پسندی پر چھوڑتے ہیں سب سے پہلے آزاد کو لیجیے "دربار اکبری" میں اکبر کے خصائل وعادات بیان کرنے میں اُنھوں نے اپنے پورے زورِ قلم سے کام لیا ہے جسکی نظیر اُنکی تمام تصانیف میں دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"اسکی طبیعت نے زمانے ہر عہد میں بدلتا رہا بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا، کبوتروں میں اُڑا دیا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے، گھوڑے بھگانے اور باز اُڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہی لیکر آئی۔ بیرم خاں وزیر، صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار، اور شراب وکباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگان دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لیے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار رہا، اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا سواری شکار بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق، علم وحکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا بلکہ علوم و کل فنون اسکے لیے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک نے یوانی فوجداری بلکہ سلطنت

کے مقدمات بھی علماے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ انکی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی، یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا، ہر شخص کی راے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے اور صلاح و اصلاح کے ساتھ عملدرآمد کرتا۔" (دربار اکبری۔ صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹)

مولانا نذیر احمد کی تصانیف میں "توبۃ النصوح" انکی سب سے بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اور اس میں بھی بالخصوص وہ حصہ جہاں انھوں نے اللہ میاں کی زبان سے بندہ کو ڈانٹ سنائی ہے، زورِ بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"اگر تو ہم کو صمیم قلب سے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا، تو گناہ پر تجھکو کیونکر جسارت ہوتی تھی؟ تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا؟ کبھی کھولتے پانی میں تو تونے ہاتھ نہیں ڈالا؟ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تونے مٹھی میں نہیں لے لیا؟ مگر تو گناہوں کا نہایت بیباکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھکو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے، یا اگر یقین تھا تو تو اسکو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا تونے اسکو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہونچی، اگرچہ تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارا کرتا تھا، مگر کیا تو اسکا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھ پر کیے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکرے! بے شمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ کو برائے نام بھی توفیق نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک

گیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا، جتنی میں تیری رعایت کرتا رہا، اُسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیاتِ بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر سے چلا تھا۔ اس چند روزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرۂ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا۔" (توبۃ النصوح، صفحہ ۱۶۱،۱۶۰)

مولانا حالیؔ کی تصانیف میں ایسی بلند اور پُرزور عبارت ملنی مشکل ہے البتہ ان کے متفرق مضامین میں "زبانِ گویا" کے عنوان سے خطیبانہ انداز میں ایک پُرزور مضمون ملتا ہے جس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:-

"اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطیِ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

"اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں.... اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور اے میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں سِن کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔" (مضامین حالی، صفحہ ۱۶۱)

آزاد، نذیر احمد اور حالی کی انشا پردازی کے اختراعات فائقہ آپ نے دیکھ لیے؟ اب ایک شبلی کی انشا پردازی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔ "ظہور قدسی" کے عنوان سے آنحضرت صلعم کی ولادت کا واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جسکے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسرے نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔ یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہ حرم، حکمران عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں

تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللّٰھم صلِّ علیہ و علیٰ آلہ و صحابہ و سلّم"

(سیرۃ النبی، حصہ اول صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴)

(۲)

گزشتہ صفحات میں، جہاں تک سوال کے پہلے جزو کا تعلق تھا، ہم نے انشاپردازی اور اسکی خصوصیات سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، تاکہ انشاپردازی کا ایک صحیح مفہوم اور معیار قائم ہو جائے۔ اب تک اردو کے سب سے بڑے انشاپرداز کی تعیین میں جو غلطی ہوتی چلی آئی ہے، اُس کا سبب یہی تھا کہ اصل میں انشاپردازی ہی کا کوئی صاف و صریح مفہوم پیش نظر نہیں ہوتا تھا۔ اسی غرض سے ہم نے ان مصنفین کی تحریروں سے مختلف نوعیتوں کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مولانا شبلی کا درجہ اپنے معاصرین انشاپردازوں میں کس قدر بلند ہے! رہا سوال کا دوسرا جزو، وہ اس قدر پیچیدہ اور بحث طلب نہیں ہے۔ بلاشبہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اُردو کے ذخیرۂ علمی میں سب سے بڑا اور بیش بہا حصہ مولانا شبلی کا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے اس خیال کی مزید تصدیق ہو جائیگی۔

**اردو کا سرمایۂ علمی** ہم جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں، اُردو ادب (یہاں ادب سے مراد صرف نثر کا ذخیرہ ہے) کی ترکیب اصلی انھی چار عناصر سے ہے، یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی، یعنی اُردو کا تمام تر ذخیرۂ علمی انھیں چار مصنفین کی کوششوں کا اندوختہ ہے باقی دوسرے مصنفین ایک حیثیت ثانوی رکھتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا کسقدر حصہ ہے اور کس قیمت کا ہے۔ شمس العلما آزاد سے پہلے جنھیں اِن عناصر اربعہ میں اوّلیت کا فخر حاصل ہے، اُردو ادب کا ذخیرہ بہت ہی مختصر اور کم مایہ تھا۔ پُرانے خیال کے لوگ زیادہ تر فارسی و عربی کی تحصیل اپنی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ کوئی کچھ لکھنا چاہتا، تو انھی دونوں زبانوں میں لکھتا۔ گو ان میں بھی فارسی کو بہ نسبت عربی کے زیادہ ...

حاصل تھا، کیونکہ یہ حکومت وقت کی زبان رہ چکی تھی جس کا اثر اب بھی لوگوں کے دلوں پر باقی تھا۔ علاوہ اس کے اسلامی اور دینی علوم بھی انھیں دونوں زبانوں میں تھے۔ اگر کسی نے بڑی ہمت کی تو تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی، اس لیے کہ یہ زبان حصول معاش کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ اردو کی طرف کسی نے اگر بڑی توجہ کی تو چند غزلیں اور قصیدے لکھ لیے یا فارسی و عربی سے بعض افسانے اور قصے ترجمہ کر کے رکھ دیے۔ بعد میں کچھ انگریزی ناولوں اور افسانوں کے بھی ترجمے ہونے لگے۔

تصانیف آزاد

غرض یہ کُل سرمایہ تھا جو شمس العلما آزاد کو وراثت میں ملا، اس میں سے بھی شاعری کے جزو کو نکال دیجیے تو یہ ترکہ اور بھی قلیل اور حقیر رہ جاتا ہے۔ آزاد نے اردو ادب کی اس بے مائگی کو محسوس کیا اور اسکی ہر صنف میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج انکے قلم کی مختلف اصناف ادب میں تحریری یادگاریں باقی ہیں۔ مثلاً ادب میں افسانے، قصے اور ڈرامے ہیں۔ تاریخ میں زبان اور ادب کی تاریخ اور اشخاص کے سوانح حالات ہیں۔ علوم میں علم الالسنہ ان کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے۔

ان کی ایک اہم تصنیف جو شاعرانہ خیال آرائیوں اور ادبی گلکاریوں کی وجہ سے آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھی جاتی ہے، "نیرنگِ خیال" ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں لٹریچر کی ایک صنف "مائیتھالوجی" ہے جس میں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مشخص طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ انسان کا تخیل اشکال و صور کو جلد گرفت کر سکتا ہے مثلاً غصہ اور رحم کو انکے خصائص طبعی کی بنا پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں پیش کیا جائے تو پڑھنے والے پر اس کا صحیح اور زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی میں اسی طرز بیان کی ایک مشہور کتاب "پلگرمس پروگرس" (سوامی جی کا سفر) کے نام سے ہے جس میں عیسوی مذہب کے عقائد اور محاسن اخلاق کو محسوس صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا

کی وہ بھی سفرنامہ ہے۔ اس کتاب کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کا ترجمہ اب تک دُنیا کی تقریباً ۴۸ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اسی طرز بیان کو پیش نظر رکھ کر آزاد نے بھی نیرنگِ خیال" لکھی ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں، ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور زنگر مناسب نے زبان کے حوالہ کیا ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا" غرض اس کتاب میں انسان کے مختلف اوصاف وخصائل، اسکے جذبات وخواہشات مشخص طور پر دکھائے گئے ہیں، مثلاً سچ، عدل، رحم، شہرت طلبی، غصہ، خود پسندی وغیرہ اپنی اپنی خصوصیات کے مطابق مرد یا عورت کی شکل میں ظاہر کیگئی ہیں۔ اخیر میں عرب، ایران وہندوستان کے مشہور ومعروف شعرا وسلاطین کی بھی جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کی گئی ہیں۔ شمس العلما آزاد کی تاریخی تصانیف میں "دربار اکبری" سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس میں اکبر اور اُسکے دربار کے بڑے بڑے اُمراء مثلاً بیرم خاں، بیربل، فیضی، ابوالفضل، ٹوڈرمل وغیرہ کے تمام حالات درج ہیں۔ اُردو زبان میں اکبری عہد حکومت کے واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ ایک جگہ ملنے مشکل ہیں جہاں تک وقائع نگاری کا تعلق ہے یہ کتاب چھوٹے بڑے تمام واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی میں بہت بڑا فرق ہے جو اس تصنیف میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اکبر اور اسکا طرز حکومت اُسکے امراء اور رعایا میں کچھ ایسا مقبول رہا ہے کہ اسکے متعلق بہت سے مصنوعی مبالغہ آمیز قصوں کا رواج پا جانا خلاف امید نہیں۔ اکبر کی حکمت عملی (پالیسی) ایسی مرنجاں ومرنج رہی ہے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اُسکا رویہ ایسا بے تعصبانہ اور رواداری رہا ہے، جو سترہویں صدی عیسوی میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے بالخصوص ہندو مسلمانوں کے ساتھ اس کا مساویانہ سلوک اس زمانہ میں ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ خود اسکے اسلام میں شبہہ کرنا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ یہ چند مہتم بالشان امور تھے جو بہت زیادہ نقد وبحث کے قابل تھے اور جس کے

ضمنی تذکرہ سے اکبر کا سوانح نگار کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اسکے عہد اکبری کی بعض زراعتی و اقتصادی اصلاحات بھی جن پر ہمارا موجودہ نظام زرعی بہت حد تک مبنی ہے کسی طرح نظر انداز کر دینے کے قابل نہ تھیں۔ اکبر کے زمانۂ حکومت میں بعض علوم و ادب مثلاً ہیئت و نجوم اور فارسی شاعری کی ترقی اور اکثر فنون لطیفہ مثلاً مصوری، نقاشی و موسیقی وغیرہ کے کمالات بھی بتفصیل ذکر کیے جانے کے لایق تھے۔ تاریخ کا تقاضا یہ تھا کہ دیگر سلاطین مغلیہ سے جو بعد میں تخت دلی پر بیٹھے اور غیر ملکی معاصر حکمرانوں سے (مثلاً ملکہ الزبتھ جو تقریباً اسی زمانہ میں انگلستان میں حکمراں تھی) اکبر اور اسکے طرز حکومت کا مقابلہ و موازنہ کیا جاتا تو آج دربار اکبری تاریخی حیثیت سے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایک بلند پایہ تصنیف سمجھی جاتی۔

اشخاص کی تاریخ لکھنے کے علاوہ آزاد نے زبانوں کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اور نہ صرف تاریخ بلکہ ایک حد تک فلسفۂ زبان کی طرف بھی توجہ کی ہے یعنی زبان کی اصل، ایک زبان کا دوسری زبانوں سے تعلق، الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ یہی علم آج مدون صورت میں علم الالسنہ یا انگریزی میں "فیلالوجی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا شوق انھیں اہل یورپ کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش کو دیکھکر پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی طرف توجہ کی اور اسکے لیے ایران اور بخارا وغیرہ کی دشوار گزار مسافت بھی اختیار کی۔ ان ممالک میں جاکر انھوں نے وہاں کے رسم رواج، لوگونکے عادات اطوار کا مطالعہ کیا نیز ژند پہلوی اور دری زبانوں کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات حاصل کیں۔ ہندوستان رہ کر سنسکرت زبان اور یہاں کے رسوم و عادات سے بہت کچھ واقفیت حاصل کی۔ غرض انکی اس علمی و لسانی تحقیق و کاوش کا اصلی مظہر سخندان فارس ہے۔ جس میں زبان فارسی کی تاریخ اور اسکی عہد بعہد کی ترقیوں سے بحث کی گئی ہے۔ علاوہ اسکے مشہور شعرا و مصنفین کے کلام کے نمونے بھی دکھائے گئے ہیں، ایرانیوں کے رسوم و رواج

کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب "نگارستانِ فارس" ہے جس میں رودکی سے لیکر واقف بٹالوی تک کے مشاہیر شعراء کی سوانحعمریاں ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن زمانہ کی تیز رفتاری کا ساتھ کون دے سکے؟ آزاد نے جہاں زبانوں کی تقسیم و تفریع کی ہے وہ علم السنہ کی موجودہ ترقیوں کے لحاظ سے ایک ابتدائی معلومات کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ علاوہ اسکے یہ علم چونکہ واقعات نہیں بلکہ زیادہ تر قیاسات عقلی پر مبنی ہے، اس لیے اسکے نظریے روز بروز بدلتے رہتے ہیں۔ اس بنا پر اب سے ۴۰ ۵۰ برس قبل کا کوئی نظریہ بھلا آج کیونکر قابل قبول ہو سکتا ہے۔ یوں الفاظ کی باہمی مشابہت و مناسبت بتانا خواہ صوری ہو یا معنوی، ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور پر لطف مطالعہ بھی۔ اس نوعیت کی ایک دوسری تصنیف "آب حیات" ہے جو مصنف کی انشا پردازی، تاریخی و لسانی تحقیق، اور ادبی تنقید کا مجموعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد کی ترقیوں پر اُردو میں اس سے پیشتر کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ اور اس لحاظ سے "آب حیات" نہ صرف اپنے طرز کی پہلی بلکہ بہت بلند پایہ کتاب ہے۔ اسی سلسلہ میں آزاد کا مرتب کردہ "دیوان ذوق" بھی آ جاتا ہے۔ گو ذوق کے حالات اور انکی شاعری کا تذکرہ "آبحیات" میں بھی آچکا ہے لیکن اُستاد ہونے کی حیثیت سے آزاد کو جو عقیدت انکے ساتھ تھی وہ ایک مستقل تصنیف سے کم کی متقاضی نہ ہوئی۔ لیکن ان تمام تنقیدی تصانیف میں بجائے اسکے کہ کہیں فلسفۂ شاعری اور اسکی خصوصیات سے بحث کی جاتی، صرف نمونۂ کلام اور شاعری کی تدریجی ترقی کے دکھانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کم از کم دیوان ذوق ہی میں اس ضرورت کو ملحوظ رکھا جاتا۔ اور ذوق و غالب کی شاعری کا تفصیل کے ساتھ باہم مقابلہ و موازنہ کیا جاتا اور ہر دو کی خصوصیاتِ شاعری بیان کرکے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی تو آج اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن ذوق کی بعض غیر مطبوعہ غزلوں کو شایع

کر دینا کافی سمجھا گیا جو کسی طرح ہماری امیدوں کے مطابق نہیں۔

غرض باوجود ان سب کے شمس العلما محمد حسین آزاد نے اُردو نثر کے دامن کو جس میں اب تک قصوں ۔۔۔ فسانوں کے سوا کچھ نہ تھا، تاریخ و ادب کے جواہر ریزوں سے بھر دیا۔ اور سچ پوچھیے تو ادب اُردو کا سنگِ بنیاد انھی نے رکھا۔ اور اس حیثیت سے انھیں ادب اُردو کا بانی اول کہا جائے تو بیجا نہیں۔

تصانیف نذیر احمد: مولانا نذیر احمد کی تمام تصنیفات پر نظر ڈالنے سے ایک عجیب اجتماع ضدین نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو انکے ناولوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے دوسری طرف انکی مذہبی سنجیدہ تصانیف ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اعلی درجہ کی عربی قابلیت اور قرآن، حدیث و فقہ پر عبور کلی ہونے کا اقتضا تو یہ تھا کہ انکے قلم سے انھی مذہبی علوم پر نہایت عالمانہ اور بلند پایہ کتابیں نکلتیں، لیکن بعض خارجی اثرات کی کشش نے انھیں اس جادۂ مستقیم سے ہٹا دیا، اور ناولوں اور افسانوں کی یہ طویل فہرست جو انکی تصنیفات میں نظر آتی ہے، اسی کشش کا نتیجہ ہے۔ انکے تصنیفی مشغلہ کا آغاز ایک عجیب طرح سے ہوا، جو خود انھی کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ اپنے "درباری لکچر" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ انکو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈھا تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال آپ کتابیں بنانی شروع کیں، بڑی لڑکی کے لیے "مرآۃ العروس" چھوٹی کے لیے "منتخب الحکایات" بشیر کے لیے "چند پند"۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں، نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالہ کر دیے مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحہ کے لیے اور جسکو ایک صفحہ کی استعداد تھی وہ ورق کے لیے مستعجل تھا۔ جب دیکھو

ایک نہ ایک تقاضا تھی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔
یوں کتابوں کا پہلا گمان پورا ہوا"

لیکن ان قلمی مسودات کو کتابی صورت میں لانے کا ہمارے ڈپٹی صاحب کو کوئی خیال بھی نہ تھا۔ انھوں نے یہ قصے اور افسانے تو محض اپنے بچوں کی خانگی تعلیم کی غرض سے لکھے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ آیندہ نسلیں ان قصے کہانیوں کو میری تصنیفات کی سرفہرست قرار دینگی۔ بہرحال ان قلمی مسودات کے مطبوعہ صورت میں آنے کا واقعہ بھی سن لیجیے جو پہلے واقعہ سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ایک دن انکے چھوٹے لڑکے بشیر کی کیمپسن صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی، ڈائرکٹر صاحب نے بشیر سے پوچھا کہ آجکل تم کیا پڑھتے ہو؟ بشیر نے جو ان کتابوں کا نام لیا تو صاحب نے تعجب سے کہا کہ ان ناموں کی کتابیں کوئی اردو میں نہیں ہیں۔ اس پر بشیر نے جواب دیا کہ یہ کتابیں تو ابا نے میرے اور آپا کے لیے لکھ دی ہیں۔ پھر کیمپسن صاحب نے کہا کہ اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور چند بند 'مراۃ العروس' اور 'منتخب الحکایات' کے قلمی نسخے اٹھا لایا ڈائرکٹر صاحب نے جب انھیں دیکھا تو 'مراۃ العروس' کو بہت پسند فرمایا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دیے جانے کی سفارش کی"

چنانچہ ڈپٹی صاحب کو اس کتاب پر ایکہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی ٹائم پیس انعام میں ملا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کا نام گورنمنٹ گزٹ میں نکل گیا۔ پھر کیا تھا، بقول خود انھوں نے "تصنیف کا ڈربہ کھول دیا....." مراۃ العروس کے بعد سینڈ فورڈ کی طرح ایک ناول "بنات النعش" لڑکیوں کے لیے لکھا اور اسکو بھی بطمع انعام سرکار میں چلتا کیا۔

غرض ڈپٹی صاحب کے تصانیف کی ابتدا اپنے بچے بچیوں کی خانگی تعلیم دینے کے

خیال سے ہوئی، اور سرکاری انعامات نے اس تیس انکی مزید ہمت افزائی کی۔ انکی تمام ابتدائی تصانیف میں ان دونوں میں سے کسی کبھی ایک جذبہ کی کارفرمائی ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے صرف ونحو میں دو رسالے اپنے لڑکے کے لیے لکھے جن کا نام مَا یُغْنِیْكَ فِی الصَّرْفِ اور مَا یُغْنِیْكَ فِی النَّحْوِ رکھا۔ ان رسالوں میں انھوں نے قدیم طریقۂ درس کو چھوڑکر کسی قدر جدت سے کام لیا تھا، جسے بدقسمتی سے اس زمانہ کے مولویوں نے پسند نہ کیا اور اس پر انھیں کچھ انعام بھی نہ ملا۔ اس کے بعد انھوں نے سرکاری اعلان پر منطق میں ایک رسالہ "مبادی الحکمۃ" لکھا جو مقبول ہوا اور پانسو انعام کا مستحق قرار پایا۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے علم ہیئت کی ایک انگریزی کتاب "گولمنز ہون" کے ترجمہ کا اشتہار مع اکہزار انعام کے شایع ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے بعض دوستوں نے انھیں اس کام پر آمادہ کیا۔ چنانچہ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور پورا کرکے گورنمنٹ ہند میں بھیجدیا۔ ایک عرصہ کی رد و کد کے بعد سرکار سے وہ ترجمہ مع اکہزار انعام کے واپس ملا۔ لیکن نہ جانے اس کے طبع ہونے کی بھی نوبت آئی یا نہیں۔ ان متفرق چھوٹی چھوٹی تصنیفات کے علاوہ ڈپٹی صاحب کے قلم سے سرکاری روئدادوں وغیرہ کے ترجمے بھی وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تعزیرات ہند کے اردو ترجمہ میں بھی ڈپٹی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

بہرحال شمس العلما نذیر احمد کے تصنیفی مشغلہ کی ابتدا خواہ کسی طرح پر ہوئی ہو لیکن افسانہ نویسی ان کا طبعزاد رنگ معلوم ہوتا ہے۔ انکے تمام ناولوں میں "توبۃ النصوح" کو غالباً سب سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا ہے۔ اسکے اقتباسات نہ صرف آج سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، بلکہ پوری کتاب کسی زمانہ میں نو وارد انگریزی حکام کے نصاب میں داخل تھی۔ ہر انگریز بتدی کے لیے جو اردو سیکھنا چاہتا تھا، اس کتاب کا پڑھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ قصہ میں چونکہ صوم وصلوٰۃ کی تاکید، خیرات وزکوٰۃ کی ہدایت اور دیگر اسلامی عقائد مثلاً

جنت و دوزخ، جزا و سزا وغیرہ کا ذکر ہے اس بنا پر شروع شروع میں گورنمنٹ نے اپنی مذہبی غیر جانبدارانہ پالیسی کے منافی سمجھ کر اسے رواج دینا مناسب نہ سمجھا تھا لیکن پھر بعد میں کوئی خاص نقصان نہ دیکھکر اسکی اشاعت کی اجازت دیدی اور اسکی وہ قدر افزائی کی کہ مسلم و غیر مسلم ہر طبقہ سے اسکی مانگ آنی شروع ہوگئی۔ پلگرمس پراگرس (سوامی جی کا سفر) جس کا "نیرنگ خیال" کے سلسلہ میں اوپر کہیں ذکر آ چکا ہے، عام مضمون کے لحاظ سے "توبۃ النصوح" سے ایک حد تک بہت ملتی جلتی ہے لیکن اس میں اسلام کے ان بنیادی اور عالمگیر عقائد و مسائل کی تصریح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے جس سے یہ کتاب بے تعصب غیر مسلموں کے دلوں کو بھی اپنی طرف مائل کر سکتی۔ لیکن ممکن ہے مسلمانوں کے طبقہ میں اصلاح اخلاق اور پابندیٔ صوم و صلوٰۃ میں کسی حد تک ممد ثابت ہوئی ہو۔

"مرأۃ العروس" جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ڈپٹی صاحب نے اپنی بڑی لڑکی کے پڑھانے کے لیے لکھنی شروع کی تھی، لیکن دراصل اسکے اندر ایک بہت بڑا مقصد نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطنتِ مغلیہ کے چراغ گل ہو جانے سے کتنے اسلامی گھرانے بے چراغ ہو رہے تھے۔ باہر کی حالت تو جیسی کچھ بھی ظاہر تھی، گھر کے اندر اس سے بھی بدتر کیفیت تھی۔ عورتوں میں نہ کوئی تعلیم و تربیت، نہ کچھ مذہبی اخلاقی روح اور نہ زندگی کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ لے دے کے کچھ پرانے رسم و رواج باقی رہ گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ بچہ کی تعلیم و تربیت کی پہلی معلم ماں ہے، اسکا پہلا مکتب گھر کی چاردیواری ہے اس لیے مردوں کی تعلیم و تربیت سے مقدم اور ضروری عورتوں کی اصلاح و تربیت ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے انھوں نے متعدد قصے اور افسانے لکھے تاکہ انھیں پڑھ کر عورتیں اپنی حالت سدھاریں اور انکی گودوں سے اچھے تربیت یافتہ بچے نکلیں۔ غرض عورتوں کے عادات و اطوار، انکی معاشرتی اور مذہبی خرابیوں اور انکی جاہلانہ رسوم و رواج کا جس عبرت انگیز طریقہ پر اس میں ذکر ہے، اسکے لحاظ سے یہ کتاب معناً بھی "مرأۃ العروس" ہے۔

جسے پڑھکر عورتیں اپنی اخلاقی و مذہبی حالت بہت کچھ درست کرسکتی ہیں - اس کتاب کا دوسرا حصہ "بنات النعش" کے نام سے موسوم ہے جس میں عورتوں کو علمی معلومات حاصل کرنے کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔ "مرأة العروس" کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اسکے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی اور کشمیری زبانوں میں بھی ہوگئے - اس سلسلہ کی سب سے آخری کتاب غالباً "رویائے صادقہ" ہے جو بعض کے نزدیک انکا سب سے بہتر ناول خیال کیا جاتا ہے - اس میں دہلی کی معاشرتی زندگی کا بہت ہی پر اثر نقشہ کھینچا گیا ہے۔

لیکن ڈپٹی صاحب کی آخری قلمی یادگاریں کچھ دوسری نوعیت رکھتی ہیں اور یہی انکا اصلی اور فطری رنگ معلوم ہوتا ہے جو اخیر زمانۂ عمر میں بالکل نمایاں ہو کر رہا - اس سے ہماری مراد مذہبی رنگ ہے۔ حیدرآباد کے سکون بخش زمانۂ ملازمت میں ڈپٹی صاحب جب سرکار انگریزی کے بار احسان سے کسی قدر سبکدوش ہوے اور حکومت کی برکات سے کنارہ کش ہوکر اطمینان و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگے تو اسوقت انھیں خدا یاد آیا - عربی زبان وادب کا ذوق انھیں بچپن ہی سے تھا - کلام جاہلیت کے سیکڑوں ہزاروں اشعار اور نثر میں صفحے کے صفحے زبانی یاد تھے - اسی ذوق ادبی کی بنا پر قرآن کا بھی بہت سا حصہ یاد کرلیا تھا - چنانچہ بعد میں صرف چھ مہینے کی محنت سے پورے حافظ ہوگئے - کلام مجید سے ایک تو ذاتی شغف اور دوسرے احباب کا ایک بامحاورہ ترجمہ کا اصرار، یہ اسباب تھے جنھوں نے ڈپٹی صاحب کو اس خدمت دین پر آمادہ کیا - ہر چند کہ کلام الٰہی کا رعب اس جرأت کی اجازت نہ دیتا تھا لیکن آخر کار کمربستہ ہوگئے اور تین سال کی مدت میں اس کام کو انجام دیا جو آج "مصحف القرآن" کی شکل میں ہر مسلمان کے ہاتھ میں نظر آتا ہے - اور جو عرف عام میں "بڑے قرآن" کے نام سے موسوم ہے - اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے ترجمے اس سے پیشتر بھی ہو چکے تھے لیکن وہ یا تو فارسی میں تھے یا تحت اللفظ اردو میں - ڈپٹی صاحب

جو فن ترجمہ سے خوب واقف تھے، تمام دشواریوں کو بخوبی سمجھتے تھے، انھوں نے دیکھا کہ فارسی ترجمہ ملک کی عام ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا اور نہ تحت لفظی کا طریقہ مطالب قرآنی کے سمجھنے میں مفید ہو سکتا ہے اس بنا پر عام فائدہ رسانی کی غرض سے انھوں نے قرآن کا بامحاورہ اُردو میں ترجمہ کیا اور ربط مطلب کے لیے قوسین میں اپنی طرف سے عبارتیں بڑھاتے گئے۔ شروع میں ہر مضمون کے آیات کی فہرست بھی دیدی ہے تاکہ کسی خاص عنوان پر قرآن حکیم سے مواد تلاش کرنا ہو تو آسانی سے فراہم کیا جا سکے۔ غرض مسلمان جو ایک عرصہ سے زندگی کے اس دستور العمل سے ناآشنا ہو گئے تھے، ڈپٹی صاحب نے انھیں اس سے روشناس کرا کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اسکے علاوہ ڈپٹی صاحب نے مسلمانوں کی عام حالت خراب دیکھکر ترجمۂ قرآن ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ انکے معمولات زندگی اور عبادات مذہبی کی اصلاح و درستی کے لیے انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھی جو "الحقوق والفرائض" کے نام سے تین جلدوں میں ہے اور جسکی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحوں سے کچھ اوپر ہے۔ اس کتاب میں بہ تفصیل یہ بتایا گیا ہے کہ "حقوق اللہ" کیا کیا ہیں اور "حقوق العباد" کیا کیا ہیں؟ کتاب کے پہلے حصہ میں تمام عبادات مع جزئیات کے آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حج کے بیان میں مسجد حرام کے مناروں اور کنگروں کی تعداد اور مسجد کا طول و عرض بھی دیا ہوا ہے۔ دوسرے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات والدین، استاد، ہمسایہ اور حکومت وغیرہ کے ساتھ کیسے ہونے چاہییں۔ جہاں حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے بحث کی گئی ہے، آج اُن کا مطالعہ کرنا دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں۔ اطاعت حکام کے لیے جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، انھیں سن کر ابتدائی جماعت کا ایک بچہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لیکن ڈپٹی صاحب کی عربی زبان و ادب کی بے نظیر قابلیت کا صحیح اور کافی استعمال یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ایک قرآن کے ترجمہ پر اکتفا کیا یا احادیث و فقہ کے

مطالب کو پھیلا کر اُردو میں لکھدیا۔ ترجمے ان سے پہلے بھی ہوئے اور بعد میں بھی ہوتے حدیث و فقہ کے مسائل کی تعلیم و تلقین کے لیے عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کیا کم ستے تھے۔ عربی کے اس فاضل سے جو کم سے کم توقع تھی وہ یہ کہ آزاد کی طرح عربی زبان و ادب کی ایک تاریخ ہی "سخندان عرب" کے نام سے لکھدیتے جو انکی بے مثال عربی دانی کا صحیح و بہترین استعمال ہوتا۔ ایک ایسی تصنیف کی کمی اُردو زبان میں عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی اور مستقبل قریب میں بھی اسکے پورے ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

تصنیفات حالی

اردو میں جس مخصوص شعبۂ علم کا اضافہ مولانا حالی کی ذات سے ہوا ہے وہ فن سوانح نگاری ہے۔ سوانح و حالات اس سے پہلے بھی اُردو میں لکھے جاتے تھے لیکن مولانا نے اس فن میں ترتیب واقعات کا جو طریقہ اور انکے انداز تحریر کا جو نمونہ پیش کیا ہے' وہ نہ صرف اُنکی علمی زندگی کا سب سے درخشاں کارنامہ ہے بلکہ اُردو میں ایک بیش بہا اضافہ بھی ہے۔ قدماء کے نزدیک سوانح نگاری کا دستور یہ رہا ہے کہ جو حالات زندگی لکھتے تھے وہ تصویر کا محض ایک رُخ ہوتا تھا یعنی اُس کے تمام تر محاسن اور خوبیاں ہی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ اسکی زندگی کے کارناموں اور اسکے حالات پر کوئی تنقیدی نظر نہ ڈالتے تھے۔ برعکس اسکے یورپ کی سوانح نگاری کا طریقہ ہے کہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ اور اسکے کارنامے گناتے تو ہیں لیکن اسکے ساتھ کہیں کہیں اسکی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اگر انکی نیت پر بیجا شبہہ کرنے کا الزام نہ دیا جائے تو یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس سے ایک طرف انکا مقصود اپنی نمائشی بے تعصبی و حق گوئی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب یہ اپنے ہیرو کی عظمت اور بزرگی جتانے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ بارگاہ اخلاق سے پہلا گروہ اگر پاسداری اور بیجا حمیت کا مرتکب کہلائے گا تو دوسرا طبقہ ریا' فریب اور خدع کا مجرم قرار پائے گا۔ مولانا حالی پر جو سرسید کی مناقب گوئی اور بیجا مداحی کا الزام لگایا جاتا ہے' اسکے لیے

وہ معذور تھے۔ یہ دونوں طریقے ان کے پیش نظر تھے، جن میں سے انھوں نے اول الذکر کا انتخاب کیا۔ یہ گویا دو برائیوں کے درمیان انتخاب تھا اور حالی نے اگر اُسے پسند کیا جو کم بری تھی، تو کیا برا کیا۔

مولانا حالی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ "حیات جاوید" سمجھا جاتا ہے۔ بیجا حمیت اور پاسداری کا جو الزام اُن پر عائد ہوتا ہے، وہ اسی تصنیف کی بنا پر ہے لیکن کوئی شخص بھی جو سرسید کی جگہ پر ہوتا اور حالی جیسا رفیق اسے ملتا تو یہی واقعہ پیش آتا۔ تقریباً ایسی ہی ایک مثال ہم کو انگریزی ادب میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے جو انگلستان کا بہت ہی لائق اور عالی دماغ شخص گزرا ہے، جب انتقال کیا تو اُسکے ایک دوست جیمز باسول نے اسکی لائف چار جلدوں میں لکھی، جس میں اسکی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی نہایت تحسین آمیز لہجہ میں۔ مولانا حالی نے بھی سرسید کے ساتھ وہی حق رفاقت ادا کیا جو باسول نے جانسن کے ساتھ کیا تھا۔ قطع نظر اس الزام کے کہ اس تصنیف میں بیجا مدح سرائی اور پاسداری سے کام لیا گیا ہے، دو خصوصیات بہت ہی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ سرسید کی زندگی کے مشہور و غیر مشہور، ضروری و غیر ضروری، دلچسپ و غیر دلچسپ ہر قسم کے واقعات کا مصنف نے استقصا کیا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ پوری کتاب شروع سے اخیر تک ایک اعتذار کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ سرسید مرحوم اپنے وقت کے ایک غیر معمولی شخص تھے ایسے زمانہ میں جبکہ ہر شخص کو نفسی نفسی پڑی ہوئی تھی، اس نیک مرد نے قوم کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں پر زوال حکومت کا خمار طاری تھا اور اس حالت میں وہ تعلیم و معاشرت، مذہب و سیاست سب کچھ بھلا بیٹھے تھے۔ سرسید نے اُن کو اس خواب گران سے جگانا چاہا لیکن اس کوشش میں ایک بڑی غلطی جو انھوں نے کی وہ یہ کہ مذہب کو ہاتھ لگا دیا۔ مذہب مسلمانوں کو جان و مال ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا ہے۔ انھوں نے اسپر

جب کبھی آنچ آتے دیکھی ہے تو سخت چراغ پا ہوے ہیں۔ مولویوں نے جب یہ مداخلت فی الدین دیکھی تو اُن پر کفر کے فتوے لگانے شروع کیے۔ دوسری طرف اسی زمانہ میں برادران وطن بڑے زور شور سے حکومت سے اپنے سیاسی و ملکی حقوق حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کر رہے تھے اور اسکے مطالبہ کے لیے تمام ہندوستان کی ایک قومی جماعت کانگریس کے نام سے قائم کر لی تھی، انھوں نے مسلمانوں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ سرسید نے یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کی قوم تعلیم میں اپنے برادران وطن سے بہت پیچھے ہے اور تاوقتیکہ وہ اس کمی کو پورا نہ کرے وہ انکا ساتھ جیسا کہ چاہیے نہیں دے سکتی ہے، اس بنا پر انھوں نے کانگریس کی شرکت سے انکو علیحدہ رکھا۔ انکے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مسائل تھے جن میں سرسید نے عام روش سے جدا اپنی راہ اختیار کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی فرقہ ان پر 'نیچریت' کا الزام لگاتا ہے اور انکی تکفیر کے درپے ہے۔ پرانے خیال کا طبقہ انگریزی اور جدید علوم کے رواج دینے پر ناراض ہے۔ برادران وطن ان کی مسلم نوازپالیسی سے نالاں اور خود مسلمانوں میں ایک جماعت ہے جو انپر سرکار پرستی اور مغربی تقلید کا الزام لگاتی ہے۔ غرض جو شخص اپنے اور بیگانوں دونوں میں اس طرح معتوب و مطعون سمجھا جائے، اس کے سوانح نگار کا لب و لہجہ اعتذار آمیز نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ رفع الزامات اور براءت کی یہی کوشش تھی جسکی بنا پر مولانا حالی نے اس کتاب میں سرسید کی زندگی سے متعلق چھوٹے بڑے ہر واقعہ کو جگہ دی اور انکے ہر قول و فعل کو مستحسن اور قابل داد سمجھا۔

تالیف لکھنے میں خواہ قدیم طریقہ اختیار کیا جائے یا جدید لیکن اتنا ضرور ہے کہ مصنف ہیرو کے انتخاب کرنے اور اسکے سوانح زندگی لکھنے میں کوئی نہ کوئی مقصد پیش نظر ضرور رکھتا ہے، مثلاً تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس مقصود ہے تو کسی بڑے پیغمبر یا ہادی کی سوانحعمری لکھے گا۔ علمی تحقیق و تفتیش کا شوق پیدا کرنا منظور ہے تو کسی ایسے

شخص کے حالات زندگی بیان کریگا جس نے اپنی تمام عمر جستجوے علم اور تحقیق مسائل میں صرف کر دی ہے۔ یا سوانح نگاری کی دوسری صورت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے عام حالات زندگی بیان کرنے کے بعد اس کا سب سے نمایاں وصف ابھار کر کے دکھائے۔ مثلاً نپولین کی لائف لکھنی ہے تو اسکے دیگر واقعات زندگی کو معمولی طور پر بیان کرنے کے بعد مصنف کا فرض ہے کہ اسکے جنگی کارنامے اور دلیری وبہادری کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ دکھائے۔ یا مثلاً نیوٹن کی سوانحعمری میں ریاضی کے متعلق تحقیقات مسائل اور اسکے دوسرے علمی اور سائنٹیفک نظریات کا ذکر تصنیف کا غالب جزو ہونا چاہیے۔ غرض یہ دونوں اصول ہیں جن میں سے ایک نہ ایک کا پابند ہونا سوانح نگار کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ انھیں مبادیات کی روشنی میں مولانا حالی کی طرز سوانح نگاری اور انکی تصنیف کردہ سوانحعمریوں کو دیکھو۔ "حیاتِ جاوید" کی تصنیف میں تو معلوم ہو چکا کہ ان مبادیات سے قطع نظر ذاتی و شخصی تعلقات کا وہی جذبہ کام کر رہا تھا جس نے باسول کو جانسن کی لائف لکھنے پر آمادہ کیا۔ باقی رہیں دو تصانیف یعنی "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ سعدی"۔ ان میں مصنف کا کوئی خاص مقصد صاف طور پر نہیں ظاہر ہوتا ہے بلکہ مولانا کا ذوقِ ادبی ہندوستان و ایران کے ان دو بڑے شعرا کے حالات زندگی لکھنے کا متقاضی ہوا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں کے لیے کوئی سبق رکھتی ہے یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر حیاتِ انسانی میں کسی نئے باب کا اضافہ ہے، بلکہ جس چیز نے غالب کو غالب بنایا وہ انکی بے مثل فلسفیانہ شاعری ہے۔ ایسی صورت میں "یادگارِ غالب" کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور، انکے معاصرین میں انکا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں ان کے کمالات پیش کرتے لیکن اس سے قطع نظر کر کے مرزا کے حالاتِ زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و امثال پر تصنیف

کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔ البتہ اخیر میں کسی قدر اردو، فارسی نظم و نثر کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری چند صفحوں میں مرزا کی فارسی نثر کا مقابلہ ظہوری، علی حزیں، اور ابو الفضل کی نثر سے کیا گیا ہے۔ اسکے لیے مصنف کی طرف سے یہ عذر کہ "یہ طریقہ جسقدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اسی قدر پبلک کے لیے خاص کر اس زمانہ میں غیر مفید بھی تھا" آج کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے، اس کا فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے۔

سوانحمریوں کے علاوہ اردو نثر میں مولانا حالی کی ایک فاضلانہ تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" ہے جس میں فن شاعری اور اسکے مختلف اصناف پر ایک حد تک فلسفیانہ اور ناقدانہ حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ بالخصوص اردو شاعری کے حسن و قبح اور اس کے اصل پر بہت کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ غیر ضروری مباحث یا بیجا طوالت سے بھی بہت کام لیا گیا ہے جس سے تصنیف کا رتبہ بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔

ہر فن کا ایک خاص موضوع بحث ہوتا ہے جسکے دائرہ سے باہر نکلنا خود مصنف اور تصنیف دونوں کی ایک بڑی خامی سمجھی جاتی ہے۔ "علم تشریح" کا ایک مصنف اگر ماہیت قلب اور اس کی نقل و حرکت سے بحث کرتے کرتے شاعری پر اتر آئے اور دل کے لیے مدفن آرزو، اور آماجگاہ مژگاں کے شاعرانہ استعارے استعمال کرنے لگے یا داغہائے دل کی تلاش میں برسوں سرمارے تو یہ اسکی کس قدر ناموزوں اور بے سود کوشش ہوگی۔ اسی طرح ایک شاعر گلاب کی تعریف کے سلسلہ میں اسکے متعلق علم نباتات کی تحقیقات شروع کر دے تو اسکا یہ فعل کس قدر مضحک ہوگا، گو اپنی اپنی جگہ پر علم تشریح اور علم نباتات اسی قدر ضروری اور مفید ہیں جس قدر شاعری و انشا پردازی۔ غرض مضامین کی بعض ایسی ہی نامناسبت اور بے تعلقی ہے، جو "مقدمہ شعر و شاعری" میں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ شعر و شاعری پر بحث کرتے کرتے شعرا کے اخلاق

کی اصلاح اور انھیں فن عروض کی تعلیم دینا ایسا ہی غیر مناسب اور ناموزوں معلوم ہوتا ہے جیسے علم تشریح میں قلب کی مرکزیت اور اس کے افعال سے بحث کرتے کرتے غالب کا یہ شعر پڑھنا شروع کردیا جائے کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا      جو چیرا تو اک قطرہ خوں بھی نہ نکلا

یہ مانا کہ بعض اردو شعراء نے مبتذل مضامین باندھے ہیں یا سنگلاخ زمینوں پہ غزلیں لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن فلسفۂ شعروشاعری سے بحث کرنے والے کو تہذیب اخلاق اور تعلیم عروض سے کیا غرض ! اسکے علاوہ بعض مثالیں جو مطالب کو واضح کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں ان میں اس قدر بیجا طوالت سے کام لیا گیا ہے اور بعض ان میں ایسی عامیانہ ہیں جو شاعری کے ایسے فلسفیانہ اور لطیف مباحث کے ہرگز شایان شان نہیں ۔

تصانیف شبلی ادب اُردو کے ذخیرہ میں اب تک ہر سہ مصنفین نے جو اضافے کیے وہ تاریخ، دینیات، سوانح اور تنقید ادب پر مشتمل ہیں۔ مولانا شبلی نے ان اصناف علوم پر تو بہت کچھ بیش بہا اضافے کیے ہی لیکن انکے علاوہ بہت سے جدید علوم وفنون کو بھی اردو سے روشناس کیا۔ ان کی تصنیفات کسی اتفاقی سبب کا نتیجہ یا سرکاری صلہ و انعام کی رہین منت نہیں بلکہ انھوں نے وقت کی ضروریات اور اردو ادب کی اصل کمی کو محسوس کرکے یہ کام شروع کیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ ہنگامی طور پر کوئی خیال دماغ میں آیا اور اس پر کچھ لکھ ڈالا یا دوسروں کو لکھتے پڑھتے دیکھا اور انکی ریس میں قلم ہاتھ میں اٹھا لیا۔ بلکہ انکے پیش نظر ایک متعین مقصد اور انکے طریقۂ عمل کے لیے ایک مقررہ لائحۂ عمل تھا۔ انھوں نے ایک طرف زمانۂ حال کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے ماضی سے سبق لیا اور دوسری طرف مستقبل پر بھی نظر رکھی۔ انھوں نے دیکھا کہ جس طرح اسلامی علوم جو سلطنت عباسیہ کے زمانہ تک مذہب اور اس کے

متعلقات پر مشتمل تھے' یونانی علوم و فنون کے اثر سے کیبارگی بدل گئے' بعینہٖ اسوقت بھی مغربی علوم اور سائنس کے رواج نے ہمارے قدیم فلسفہ، کلام، تاریخ اور ادب کی بنیادوں کو متزلزل کردیا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے تصنیف و تالیف کا ایک مستقل لائحہ عمل تیار کیا جس کی بعض تفصیلات ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اسکا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے۔

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں پھر ان مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آجکل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں' ان میں موازنہ کرکے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ، اسماء الرجال معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ انھی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں' موازنہ کرکے بتانا چاہیے کہ دونوں کے مختلف خصوصیات کیا ہیں' اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے؟

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے' کیونکر بڑھے' کس کس زبان میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوئیں' اور کن اسباب سے ہوئیں؟ ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے؟ کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے؟

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں' اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخانہ مضامین لکھے جائیں مثلاً انتظام عدالت

انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا؟"

اس خاکہ کو سامنے رکھیے اور مولانا شبلی کی تمام تصانیف کی لحاظِ فن تقسیم کیجیے اور پھر ہر ایک کا جائزہ لیجیے کہ انھوں نے ان دوراندیشانہ اور بلند پایہ تجاویز کو کہاں تک عمل کا جامہ پہنایا، اور جو کچھ ان سے رہ گیا، اس کی تکمیل میں اُن کے اخلاف کس قدر سرگرمی و انہماک کے ساتھ کوشاں ہیں۔ غرض مولانا شبلی کی تصانیف کی اگر بڑی بڑی تقسیم کی جائے تو وہ تاریخ اشخاص، یا تاریخ علوم یا ان دونوں کے علاوہ تنقید ادب پر مشتمل ہونگی۔

کارلایل کا ایک نہایت بلیغ فقرہ مشہور ہے کہ "تاریخ عالم صرف اسکے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے"۔ غالباً اسی قسم کا کوئی خیال تھا جسکی بنا پر مولانا شبلی نے اسلام کی ایک مکمل اور باضابطہ تاریخ لکھنے کے بجائے "ناموران اسلام کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی "الفاروق" ہے جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سوانحعمری اور اُنکے علمی و عملی کارناموں کی محققانہ تاریخ ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو یہ تاریخ اسلام کے روشن ترین صفحات ہیں۔ الفاروق مولانا کے مورخانہ اجتہادات اور علمی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے جسکے لیے اُنھوں نے مصر، شام اور ترکی جیسے دور دست ممالک کی خاک چھانی۔ المامون اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے، جو ہارون الرشید کے بیٹے مامون کی سوانحعمری ہے۔ بلکہ ایک طرح سے عہد عباسیہ کا ایک چھوٹا سا مرقع ہے۔ یہ دونوں تصانیف اسقدر معروف ہیں کہ انکے متعلق اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

مولانا شبلی نے نہ صرف صاحبان تاج و تخت کی سوانحعمری لکھی بلکہ اہل علم و فن کے حالات زندگی بھی درج کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے قابل فخر تصنیف

امام اعظمؒ کی سوانحعمری ہے جو سیرۃ النعمان کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں امام صاحب کے تفقہ فی الدین اور اجتہاد مسائل سے بحث کرنے کے علاوہ علم فقہ کی مختصر تاریخ بھی ہے یعنی یہ کہ یہ علم کب سے رائج ہوا؟ کب اسکی تدوین ہوئی؟ فقہ حنفی کے اس قدر قبول و شیوع ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت محققانہ جواب دیا ہے لیکن اسکے علاوہ ایک بڑا کام اور بھی کیا ہے۔ اسلامی فقہ پر یورپ کی طرف سے ایک بڑا الزام یہ چلا آتا تھا کہ یہ قوانین روما سے ماخوذ ہے۔ مولانا شبلی نے اس کتاب میں اس الزام کی تردید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ امام صاحب کے وقت تک یورپ سے قانون یا فقہ پر کوئی کتاب ترجمہ ہوکر نہیں آئی تھی اور فقہ حنفی جو کچھ بھی ہے وہ امام صاحب کا خود اپنا اجتہاد ہے اسی سلسلہ کی ایک دوسری تصنیف "سوانح مولانا روم" ہے۔ مولانا روم کو اب تک دنیا ایک صاحبدل، اہل باطن کی حیثیت سے جانتی تھی اور انکی مثنویوں کو اسرار نہانی کا خزینہ اور کشف صدور کا ذریعہ سمجھتی تھی لیکن انھیں مولانا شبلی نے ایک دوسری حیثیت سے پیش کیا ہے۔ انکی مثنویوں سے جس طرح صوفیائے کرام تصوف کے مسائل اخذ کرتے ہیں، مولانا نے ان سے عقائد و کلام کے مضامین کا استنباط کیا ہے اور نہ صرف یہی بلکہ شاعری کی حیثیت سے بھی دکھایا ہے کہ انکا درجہ کس قدر بلند ہے۔ اسی ضمن میں طریقت شریعت اور معرفت کی منطقیانہ تعریفیں بھی کی ہیں اور ان پر جس حکیمانہ انداز سے بحث کی ہے، وہ اسدد کی بساط دیکھتے ہوئے بہت بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مولانا شبلی نے تصوف اور اس سے متعلق بعض مسائل کی طرف اس کتاب میں مختصراً جو کچھ لکھا ہے، انھیں "الغزالی" میں میدان کشادہ پاکر نہایت تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امام غزالیؒ کے حالات زندگی اور بھی کوئی شخص چاہتا تو آسانی کے ساتھ لکھ سکتا تھا لیکن دونوں میں جو فرق ہوتا، اسکا اندازہ کسی قدر "الغزالی" پڑھ کر ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے اس بڑے امام کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کو اس سادہ اور عام فہم طریقہ پر بیان کیا ہے

جسے پڑھ کر فلسفہ کے متعلق ایک معمولی علم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے تصوف کی وجہ تسمیہ اور اسکی مختلف توجیہات نہایت سلجھے ہوے پیرایہ میں بیان کی ہیں "سیرۃ النبیؐ" نہ صرف تصانیف شبلی کی اس نوع یعنی 'تاریخ رجال' میں آخری تصنیف ہے بلکہ خود مولانا کی زندگی کا سب سے آخری کارنامہ ہے۔ پیغمبر اسلام کی سیرت لکھنی کوئی نئی یا غیر معمولی بات نہ تھی، لیکن اکثر معمولی اور پرانی باتیں اسقدر محتاج توجہ ہوتی ہیں جتنی نئی اور غیر معمولی نہیں ہوتیں۔ سیرت یا نبی اکرم کی زندگی پر تقریباً ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر زبان میں جسے اسلام سے کچھ بھی تعلق رہا ہے، کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ خود عربی میں ہزاروں لاکھوں تصانیف مختلف حیثیتوں سے آپ کی زندگی اور اخلاق پر موجود ہیں۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ نے جب اسلام کی طرف اعتنا کیا تو صدہا کتابیں آپ کی زندگی اور آپکے مشن پر مختلف مصنفین کے قلم سے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں بھی اس پیارے نبیؐ کی حیات طیبہ پر کچھ نہ کچھ ذخیرہ موجود ہے لیکن ان سب کے باوجود ایک جدید تصنیف کی ضرورت اردو میں بہر حال محسوس ہو رہی تھی جو موجودہ سیرتوں سے یا کسی کتاب کے ترجمہ سے ہرگز پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں مولانا شبلی کا ایک ایسی تصنیف کا جو روایات کی پیچیدگی اور مغربی زہر آلود خیالات کی آلائشوں سے پاک ہو، اپنے ہاتھ سے داغ بیل ڈالنا اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اردو کی ایک ناقابل فراموش خدمت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا مرحوم اس کام کو اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حق میں اسکی عدم تکمیل ہی مفید ہوئی۔ اس سلسلہ سے آپ کے بعد ایک جماعت ایسی نکل آئی جو نہ صرف اس کام کی تکمیل میں سرگرم ہے بلکہ اردو کی دوسری بیش بہا اور گرانقدر خدمات بھی انجام دے رہی ہے۔

اردو تصانیف میں مولانا شبلی نے جس نئے باب کا اضافہ کیا ہے، وہ علوم و فنون

کی تاریخ ہے اب تک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی تک میں علوم و فنون کی تاریخ لکھنے کا کوئی دستور نہ تھا۔ مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو ادب بلکہ اسلامی ادب میں یہ بیش بہا اضافہ کیا ہے ۔۔۔ یہ ہے ضمنی طور پر انھوں نے بعض علوم مثلاً فقہ وغیرہ کی تدریجی ترقی پر لکھنے کی کوشش کی ہو لیکن "علم الکلام" انکی وہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے باقاعدہ طور پر اس علم کی ابتدا، اسکے عالم وجود میں آنے کے اسباب، اس کی عہد بعہد کی ترقیوں اور اس پر خارجی حالات کے اثرات سے مفصل بحث کی ہے اور اسی سلسلہ میں اکابر متکلمین کے حالات بھی مختصر طور پر لکھے ہیں اور انکے دقیق فلسفیانہ خیالات کی بھی تشریح کرتے گئے ہیں۔ اصل میں یہ کتاب "الکلام" کا پیش خیمہ تھی جو اس فن پر ایک مستقل تصنیف ہے۔ اپنے عام موضوع سے علیحدہ اس نئے باب پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی .......... کہ اس زمانہ میں مغربی علوم و تہذیب کا چرچا گھر گھر پھیلا ہوا تھا جسکی وجہ سے لوگوں کے مذہبی عقائد کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی تھیں۔ سائنس کا اس قدر زور تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان نظر آنے لگا تھا، اس بنا پر بعض لوگوں نے ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن مولانا نے مسلمانوں کے اسی قدیم علم کلام کو اس جدید صورت حال کے مقابلہ کے لیے کافی سمجھا اور اس غرض سے انھوں نے اس فن پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ یہ کتاب لکھی جس میں انھوں نے مذہب کی ضرورت، اسلام کے فضائل، وجود باری کے دلائل، معجزات کا ثبوت، نبوت کی حقیقت اور یورپ کے ایک بہت بڑے الزام یعنی "اسلام مانع ترقی ہے" کا جواب اور ان تمام مسائل پر نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

مولانا کی تصانیف میں تیسری نوع "تنقیدات ادب" کی ہے جس میں سب سے معرکۃ الآرا تصنیف "شعر العجم" ہے۔ کسی قوم کے ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرو، تنقید ادب

کا درجہ سب سے بعد میں آئیگا اور اسکی وجہ ہے، کیونکہ تنقید موقوف ہے ذخیرۂ ادبی
کی فراہمی پر، تا وقتیکہ ادب کا ایک کافی ذخیرہ موجود نہ ہو تنقید کا فن وجود میں نہیں
آسکتا - اور اس سے بڑھ کر "تنقیدات عالیہ" جو نہ صرف ذخیرۂ ادبی کی موجودگی بلکہ بہت
حد تک قوم کی صلاحیت و قابلیت پر بھی موقوف ہوتے ہیں - اردو اگرچہ اپنی زندگی
کے اس قلیل عرصہ میں اس قدر ذخیرہ فراہم نہ کر سکی تھی لیکن اسکے پڑھنے والوں میں
کم ازکم وہ صلاحیت و استعداد ضرور موجود تھی - اس بنا پر فارسی شاعری پر تنقیدات
عالیہ اردو کے لیے نہ صرف ایک وقت کی چیز بلکہ اسکی نشو ونما میں بہت حد تک
مفید ثابت ہوئی - فارسی شاعری پر اس طرز کی تصنیف نہ صرف کسی اور زبان بلکہ
خود فارسی میں بھی موجود نہیں ہے "شعر العجم" کا نام لیتے ہی اور اسکے ساتھ اس ادعا
کو سن کر بعض لوگوں کا خیال پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کی طرف مائل
ہو رہا ہوگا، لیکن یہ خیال غالبًا دونوں سے کماحقہٗ واقفیت نہ ہونے کی بنا پر ہوگا -
براؤن نے ایران کی دماغی و ذہنی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے نہ کہ ایران کی شاعری
پر - مستشرقانہ قابلیت اور وسیع النظری اور چیز ہے اور شعر و سخن کا مذاق اور ذوق ادب
کا ہونا ایک دوسری چیز - مولانا شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آشنائے فن ہو کر لکھا ہے جس سے
براؤن صاحب قطعًا محروم تھے - اس نوع کی دوسری تصنیف "موازنۂ انیس و دبیر"
ہے جس میں انیس کی شاعری کو دبیر پر ترجیح دی گئی ہے اور جسکے شایع ہونے پر بڑی لے دے
ہوئی - چنانچہ اس کے جواب میں ایک صاحب نے نہایت زور شور سے "المیزان"
کے نام سے ایک کتاب لکھ ڈالی جس میں انھوں نے نہایت انصاف کے ساتھ
انیس اور دبیر کے دونوں پلے برابر رکھنے کی کوشش کی ہے - ان معتقانہ مناظروں سے
قطع نظر اگر انصاف سے دیکھا جائے تو شعر العجم اور موازنہ دونوں اردو ادب میں اپنا
کوئی نظیر نہیں رکھتے -

سب سے اخیر میں مولانا کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو "مقالاتِ شبلی" اور "رسائلِ شبلی" کے نام سے الگ الگ چھپا ہے۔ ان میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جو اردو میں تاریخی حیثیت سے آج بھی اسی قدر رفیع ہیں۔ مثلاً "جزیہ" "کتبخانۂ اسکندریہ" "فلسفۂ یونان و اسلام" وغیرہ۔ جزیہ کا مسئلہ نہ صرف اسلام میں بلکہ تاریخ ہند میں بھی ایک ما بہ النزاع مسئلہ رہا ہے۔ غیر مسلمین پر اس ٹیکس کا عائد کرنا نہ صرف طلبہ کے نزدیک بلکہ اساتذہ کے زمرہ میں بھی اسلام کا ایک بہت بڑا ظلم سمجھا جاتا تھا لیکن مولانا شبلی نے جس محققانہ انداز میں اس بے بنیاد ظلم کی بیخکنی کی ہے اسے دیکھ کر مصنف کی مورخانہ قابلیت کا غیر ستائشی اعتراف کیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام بھی مسلمانوں کی گردن پر ایک زمانہ سے چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ بیگانے تو بیگانے بیگانوں کو بھی اس ظلم کا یقین ہو چلا تھا لیکن مولانا شبلی نے اصل حقیقت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ انکے وسیع ذرائع تاریخی پر دسترس رکھنے کا بین ثبوت ہے۔ اس سلسلہ میں ایک چیز رہی جاتی ہے وہ مولانا کے مکتوبات ہیں جو انکی غیر ارادی اور بے تکلفانہ انشا پردازی کا نمونہ ہیں اور وہ بھی کسی طرح ادبی حیثیت سے دوسرے انشا پردازوں کے مجموعہ مکاتیب سے کم نہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ برعکس اور لوگوں کے مکتوبات کے علمی و تعلیمی معلومات و افکار کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔

خاتمہ

مسئلہ کے ہر دو پہلو یعنی ادبی و علمی کا جہاں تک تعلق تھا، ان پر کافی بحث ہو چکی اور ہر ایک کے متعلق دلائل و واقعات کا دستیاب ہونا جہاں تک ممکن تھا وہ سب پیش کیے جا چکے۔ اب انپر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ فرق بخوبی واضح ہو جائیگا کہ سرسید نے اردو زبان و ادب کا سنگ بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالی نے اس پر بہت کچھ اضافے کیے لیکن اس تعمیر کی تکمیل جسکے ہاتھوں ہوئی وہ شبلی کی ذات ستودہ صفات تھی۔ یہ تاریخی حقیقت اگر صحیح ہے کہ سلطنت مغلیہ کی بنیاد بابر نے ڈالی اور ہمایوں نے اسے بہت کچھ سنبھالا۔ لیکن جس نے سلطنت مغلیہ کو اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی بڑی بڑی

سلطنتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہو سکے۔ وہ شہنشاہ اکبر تھا، تو اس میں شبہ نہیں
کہ آزاد نے اُردو کا علمی زبان کی حیثیت سے تخم رکھا اور نذیر احمد اور حالی نے اس میں
سلاست و روانی کے ذریعہ اس کی نشوونما کی۔ لیکن جسنے اردو کو دنیا کی اور زبانوں
کے ساتھ آنکھیں ملانے کے قابل بنایا وہ شبلی تھے۔ اسی طرح اردو ادب کو جسنے اس قدر
مضامین اور معانی کے خزانوں سے مالامال کیا کہ وہ اپنے ہمعصر لٹریچرز کے ہم پلہ ہو سکے،
وہ شبلی کی ذات تھی۔ بیشک آزاد نے اشخاص کے حالات زندگی لکھے اور حالی نے
اسے ترتیب دیکر ایک فن کی صورت دی لیکن شبلی نے اس فن کو جس درجۂ کمال پر پہونچایا
اس کا ثبوت "الفاروق"، "سیرۃ النبی" اور "الغزالی" دے سکتی ہیں۔ آزاد نے اردو اور
فارسی شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حالات لکھے، حالی نے "شعروشاعری" پر فلسفیانہ
نقطۂ نظر سے بحث کی، لیکن شبلی نے چار جلدوں میں "شعر العجم" اس ناقدانہ اور فلسفیانہ
نقطۂ خیال سے لکھی جسکے آگے آزاد کی "سخندان فارس" اور "آبحیات" اور حالی کا "مقدمہ"
ہیچ ہے۔ آزاد و حالی نے اپنے بعض مخصوص شعرا کو لیکر "دیوان ذوق" اور "یادگار غالب"
ترتیب دی لیکن ذوق و غالب اپنے مرتبہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھے۔ شبلی نے
جب "موازنہ" لکھا تو انیس کی تمام عالم میں ایک دھوم مچگئی۔ نذیر احمد نے اگر کسی سنجیدہ
مضمون کو ہاتھ لگایا تو مذہب کو لیا اور وہ بھی خدمت دین کے خیال سے۔ لیکن
شبلی نے مذہب کو ہاتھ لگایا تو اسوقت جبکہ وہ مغربی علوم اور سائنس کے نرغہ میں
تھا۔ انھوں نے "علم الکلام" اور "الکلام" اسی غرض سے لکھی کہ مذہب کو اسکے ان دشمنوں
سے بچائیں۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اسلام کو ان تصانیف نے اس سے کہیں زیادہ
فائدہ پہونچایا جتنا نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن اور "الحقوق والفرائض" سے ہو سکتا تھا۔
شبلی نے اکیلے اسلام پر اسقدر ذخیرہ جمع کر دیا جتنا انکے دیگر معاصرین نے کسی چھوٹے
سے چھوٹے مضمون پر بھی نہیں کیا۔ اور اس بنا پر اردو اپنی فارسی اور عربی بہنوں

کے مقابلہ میں جسقدر ناز کرے کم ہے۔ اسلام عرب سے اٹھا فارس اسکا عرصہ تک مسکن رہا۔ لیکن اس کے متعلق اس قدر گراں بہا سرمایہ مرتب صورت میں عربی و فارسی دونوں میں ملا کر بھی نہ ہوگا، جتنا اس اردو میں موجود ہے۔ اور یہ سب شبلی کا طفیل ہے

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر دکھلائے زمن مجھکو

سعید انصاری

علیگڈھ - ۳۱ر جنوری ۲۵ء

# ضمیمہ

## فہرست کتب جو زیر مطالعہ رہیں

(۱) کولرکاوچ :-

۱- فن انشا

(۲) فریڈرک ہیریسن

۲ انتخاب کتب

(۳) ایم کے گاندھی :-

۳- ینگ انڈیا (کتابی صورت میں)

(۴) ایم - مہدی حسن :-

۴- افادات مہدی

(۵) شمس العلما محمد حسین آزاد :-

۵- آب حیات

۶- نیرنگ خیال

۷- دربار اکبری

۸- سخندان فارس

۹- دیوان ذوق

(۶) خواجہ الطاف حسین حالی :-

۱۰- حیات سعدی

۱۱- حیات جاوید

۱۲- یادگار غالب

۱۳- مقدمہ شعروشاعری

(۷) مولانا نذیر احمد :-

۱۴- توبۃ النصوح

۱۵- مراۃ العروس

۱۶- بنات النعش

۱۷- رویائے صادقہ

۱۸- الحقوق والفرائض

۱۹- مصحف القرآن

۲۰- درباری تکبیر

۲۱- موعظہ حسنہ

(۸) مولانا شبلی نعمانی

۲۲- سفرنامہ مصروشام وروم

۲۳- الفاروق

۲۴- المامون

۲۵- سیرۃ النعمان

۲۶- سوانح مولانا روم

۲۷- شعرالعجم (ہر چہار حصص)

۲۸- الغزالی

۲۹- الکلام

۳۰- علم الکلام

۳۱- مضامین عالمگیر

۳۲- موازنۂ انیس ودبیر

۳۳- سیرۃ النبی

۳۴- مکاتیب (ہر دو حصص)

۳۵- رسائل شبلی

۳۶- مقالات شبلی

## مرزا رجب علی بیگ سرور

- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور

## امیر مینائی

- امیر اللغات (مکمل)
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- مکاتیب امیر

## جلال مرحوم لکھنوی

- سرمایۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث
- قواعد المنتخب

## مرزا محمد عباس ہوش

- افسانۂ اودھ
- پیاری سہیلی

## مرزا رسوا مرحوم

- اختری بیگم
- امراؤ جان ادا
- خونی شہزادہ
- شریف زادہ
- ذات شریف
- لیلیٰ مجنوں

## ریاض خیرآبادی مرحوم

- حرم سرا
- ناشاد

## پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد کامل
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- [illegible]
- کامنی

## منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

## منشی جوالا پرشاد برق

- قمر المنیٰ
- مار آستین
- بنگالی دولھن
- پرتاب
- رومینی

## سید عاشق حسین عاشق

- [illegible]
- شادی و غم

## منشی احمد حسن کاکوروی

- الدین و الدنیا
- فسانۂ لندن

## مولانا عبد الحلیم شرر

- ثانی تہمینہ
- ذی النورین
- ابو الحسنین
- خواجہ معین الدین چشتی
- حسن بن صباح
- عصر قدیم
- تاریخ یہود
- مسیح اور مسیحیت
- عرب قبل از اسلام
- صقلیہ میں اسلام
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- العانسہ
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- بابک خرمی
- طاہرہ
- مینا بازار
- فلورا فلورنڈا
- آغا صادق کی شادی
- فردوس بریں

## حکیم سراج الحق

- مسلمانان عہد [illegible]
- ماہ درخشاں
- فیروز شاہ

## شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- عالم خیال
- دیوان شوق

## منشی محمد احسن حشمی

- نغمۂ حرم
- اشک حسرت
- معشوقۂ عرب
- محبوس گمشدہ

## خواجہ عشرت لکھنوی

- تذکرۂ آب بقا
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری چار کتابیں
- لغات اردو
- ہندو شعرا

## منشی موہن لال نعم

- بزم اکبری
- جہاز سلطانہ
- خاتون اودھ
- فریب حسن
- مقدس نازنین
- سکندری کا چھلا

## مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

- تاریخ گجرات
- تذکرۂ گل رعنا

## حکیم احمد حسین مرحوم

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- 〃 〃 جلد دوم
- 〃 〃 سوم
- 〃 〃 چہارم
- 〃 〃 پنجم
- 〃 〃 ششم
- 〃 〃 ہفتم
- 〃 〃 ہشتم
- 〃 〃 نہم
- 〃 〃 دہم
- 〃 〃 یازدہم
- 〃 〃 دوازدہم
- 〃 〃 سیزدہم
- 〃 〃 چہاردہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

## مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس
- مختصر تاریخ اسلامی
- مولدین

## مولانا اکبر شاہ خاں

- تاریخ اسلام ۳ جلد
- آئینۂ حقیقت نما

## مولانا اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ مصر
- عباسیہ بغداد
- خلافت آل عثمان
- عمرو بن العاص
- تاریخ نجد

## قاضی محمد سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین ۳ جلد
- سفرنامۂ حجاز

## مولوی انشاء اللہ مرحوم

- سیرۃ الرسول
- تاریخ دولت عثمانیہ
- حال عراق و عرب
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ
- محاربات طرابلس

## مولانا نجم الغنی رامپوری

- بحر الفصاحت
- تاریخ اودھ
- تاریخ حیدرآباد دکن
- تاریخ راجگان ہند
- تعلیم الایمان
- [illegible]

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

### مولوی عزیز مرزا مرحوم
- سیرۃ المحمود
- وکرم اروسی

### مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب عہ
- تکمیل دیوان حسرت
- نکات سخن ۳ حصے

### سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- حکایات و احتساسات
- پرانا خواب دو افسانے
- ثالث بالخیر ۸/
- نہرا ۸/
- جلال الدین خوارزم شاہ
- جنگ جدال ۱۲/

### مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- چوروں کا کلب ۹/
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- لال کھنور

### پروفیسر جلیل قدوائی ایم اے
- اصنام خیالی
- سیر گل
- موناوانا
- نقش ونگار عہ
- انشہ

### منشی امتیاز علی بی اے
- سراج منیر
- ہیملٹ

### منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

### منشی امیر احمد علوی بی اے
- تاریخ اندور ۱۲/
- روزنامچہ حج
- شاہان مالوہ عہ
- طرۂ امیر
- گوتم بدھ ۸/
- یادگار انیس

### مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- تاریخ اخلاق یورپ
- پیام امن
- تصوف اسلام
- سفر حجاز
- زود پشیماں ۸/

### مولوی محمد یحییٰ تنہائی اے
- تاریخ امریکہ
- سیر المصنفین ۲ جلد
- تاریخ مغربی یورپ
- خیالات ارونگ

### مرزا محمد عسکری بی اے
- ادبی خطوط غالب
- تاریخ ادب اردو للعہ
- نوادر عہ

### پنڈت برج نرائن چکبست
- صبح وطن
- مضامین چکبست

### سید مسعود حسن رضوی ایم اے
- روح انیس
- ہماری شاعری
- امتحان وفا

### پروفیسر منہاج الدین
- ریڈیو
- زینت آسماں
- نظریۂ اضافیت للعہ

### مولوی محمد ظفر ایم اے
- روح القرآن
- روحوں کے کرشمے

### مسلم عظیم آبادی ایم اے
- فارسی علوم اور اسلام ۱۲/
- سلیقۂ تحریر

### مسٹر حامد اللہ افسر بی اے
- پیام روح بانصفحہ
- ڈالی کا جوگ

### مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن للعہ
- نقوش مدراس
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک عہ
- خیام

### مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- التربیۃ الاستقلالیہ
- شعر الہند ۲ جلد

### مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

### مولوی سعید انصاری
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

### حاجی معین الدین ندوی
- خلفائے راشدین
- مہاجرین حصہ اول للعہ

### شاہ معین الدین
- مہاجرین حصہ دوم
- سیر الصحابہ جلد ششم
- جلد ہفتم

### خواجہ حسن نظامی دہلوی
- میلاد نامہ عہ
- ذکر غوث پاک ۱۲/
- کرشن جیون
- سیپارۂ دل
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲/
- آئین خطوط نویسی
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت عہ
- اولاد کی شادی عہ
- آپ بیتی کہانیاں ۱۰/
- بچوں کی کہانیاں ۱۲/
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے

### سید ظہور احمد حشتی
- اسلامی زندگی
- تصویر معاشرت عہ
- عورت کی عبرت
- زندگی کی صبح و شام
- طوفان زندگی
- عروج زندگی
- مالی پریشانیوں کا علاج
- وسائل معاش

### ڈاکٹر سعید احمد بریلوی
- اسلام اور عبادت ۸/
- اسلام اور عورت ۱۰/
- پتھر سے ہیرا ۱۴/
- امن باغباں

### مولانا راشد الخیری
- آمنہ کی آنکھیں عہ
- آمنہ کا لال
- سیدہ کا لال
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی ۲ جلد
- نوحۂ زندگی ۱۲/
- دُرِ شہوار ۱۰/
- منازل السائرہ ۲ جلد
- سراب مغرب
- بنت الوقت ۸/
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- محبوب خداوند ۱۲
- نالۂ عشق ۱۰
- وداع ظفر

### مسٹر سلطان حیدر جوش
- صبر کی دیوی
- فسانۂ جوش

### نیاز فتحپوری
- جذبات بھاشا
- گہوارۂ تمدن
- شہاب کی سرگذشت
- نگارستان
- جمالستان للعہ

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ